بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خلاصہ

اشرف السوانح

سوانح حیات

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

جدید اسلوب

مولانا نور احمد، فاضل دیوبند

منشی عبدالرحمٰن خاں

قاری اخلاق احمد صدیقی

ناشر

دارالکتب سہارن پور (یوپی)

تاریخ طبع

از حضرت مولانا محمد جمیل الرحمٰن صاحب، نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

خوب ہے یہ سوانح اشرف
نظر آتا ہے جس میں عہد سلف

اس کا ہر واقعہ نمونہ ہے
کل کی کل ہے مثال بہر خلف

سال طبع بھی خوب ہے اس کا
خوب ہے کل سوانح اشرف

۱۳ ھ ۷۹

سنہ طباعت بار اول.....................۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۵۹ء

سنہ طباعت بار دوم.....................۱۴۴۳ھ مطابق ۲۰۲۲ء

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجدد الملت حکیم الامت سیدی وسندی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کی ذات گرامی مسلمانوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی تابع سنت زندگی کا ہر ایک قدم امت کے لئے درس حیات ہے، آپ کی حیات طیبہ کے اہم حالات آپ کی حیات ہی میں آپ کے خلیفہ خاص مخدومی حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب نے تین ضخیم جلدوں میں قلم بند فرمائے تھے، پھر چوتھی جلد بعد وفات لکھی۔ جن حضرات کو کبھی اس دربار کی حاضری نصیب ہوئی، اور آپ کی شبانہ روز مجددانہ وحکیمانہ مقالات سننے دیکھنے کا اتفاق ہوا، وہ جانتے ہیں کہ ان چار جلدوں میں بھی

حضرت ممدوح کی زندگی کا محض ایک اجمالی خاکہ ہی ضبط کیا جا سکا ہے، لیکن آج کل مسلمان جس دورِ اضطراب سے گذر رہے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے ان چار جلدوں کا خریدنا، پھر دیکھنا خاص خاص ہی لوگوں کو نصیب ہو سکتا ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کی تلخیص ایسی کی جائے جس کو ہر شخص بآسانی مطالعہ کر سکے۔ الحمد للہ عزیز محترم عالمِ صالح مولانا نور احمد صاحب فاضلِ دار العلوم دیوبند نے اس کام کو نہایت اچھی صورت میں پورا فرمادیا کہ اہم چیزوں کو اختصار کے ساتھ لے لیا۔ اللہ تعالیٰ مؤلف سلمہٗ کو جزائے خیر اور کتاب کو مسلمانوں کے ئے نافع ومفید بنادیں۔ وماذلک علی اللہ بعزیز۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہٗ

۱۰ / جمادی الاولیٰ ۱۳۷۰ھ

تقریظ

حضرت مولانا شمس الحق صاحب

صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ!

مختصر سوانح اشرفی کا مطالعہ بندہ ناچیز نے کیا، اور بہت مستفید ہوا، طویل اشرف السوانح کا لطف آیا۔

آج کل عام طور پر لوگ مختصر ڈھونڈتے ہیں، ان شاء اللہ امید ہے کہ اس "مختصر" سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا، صاحب سوانح سیدی حضرت حکیم الامت مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح کا مطالعہ اور اس سے زندگی کی ہر حالت میں سبق حاصل کرنا بہت ہی ضروری ہے، بالخصوص طالب علموں کو اس سوانح کا مطالعہ بہت ہی ضروری ہے۔

حصولِ علم کے بعد لوگ سیاسیات و معاشیات میں جو افراط اور تربیت اخلاق، اصلاح باکن و تعلیم و تبلیغ دین میں جو تفریط کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح سے سبق حاصل کر کے عمل پیرا ہونے سے وہ

افراط وتفریط دور ہوکراعتدال اور حفظ حدود کی حالت اور خدمت دین، اعلاء کلمۃ اللہ اور احیاء اسلام واجرائے نظام اسلام کے واسطے مرمٹنے کا صحیح جذبہ پیدا ہوگا۔

حق تعالیٰ مؤلف سلمہ کو اجر جزیل عطا فرمائے اور اس تالیف کو مقبول فرما کر مفید خاص وعام بنائے۔ آمین یا رب العالمین بحرمۃ سیدالمرسلین، خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

احقر الخلق شمس الحق عفی عنہ فریدپوری

٦/ جمادی الاولیٰ ١٣٧٠ھ

صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم بڑا کٹرہ

ڈھاکہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خلاصہ اشرف السوانح

(یعنی)

سوانح حیات حضرت مجدد الملۃ حکیم الامت الحاج الحافظ
القاری مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس اللہ اسرارہٗ

نسب اور خاندان

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل راجہ بھیم نے ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ اپنے نام سے بسایا جو تھانہ بھیم کہلایا پھر مسلمانوں کی آمد ہو سکونت پر اس کا نام ''محمد پور'' ہوا جس کا ثبوت اس وقت کے شاہی کاغذات سے ملتا ہے مگر یہ نام مقبول ومشہور نہ ہوا اور وہی پرانا نام معروف رہا البتہ ''تھانہ بھیم سے تھانہ بھون ہو گیا صوبہ جات متحدہ آگرہ واودھ کا یہ قصبہ اپنی مردم خیزی میں مشہور چلا آرہا ہے اور یہاں کے مسلمان شرفاء اہل شوکت وقوت اور صاحب فضل وکمال رہے ہیں۔

مجدد الملت شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے اجداد نے آج سے صدیوں پہلے اسی قصبہ'' تھانہ بھون'' میں طرح اقامت ڈالی تھی،

ددھیال کے اجداد نسباً فاروقی تھے۔ ان میں ایک مولانا صدر الدین جہاں تھے (جو قاضی محمد نصیراللہ خاں کے ہم عصر ہیں جن کا ذکر عہد اکبری کے کاغذات میں ملتا ہیں) ان کے قریبی اجداد تھانیسر ضلع کرنال سے نقل سکونت کر کے تھانہ بھون آئے تھے اور اسی طرح ننھیالی اجداد نے (جو علوی تھے) پہلے پہل جھنجھانے میں سکونت اختیار کی تھی اور پھر یہاں آگئے تھے۔

مجدد الملت کے والد ماجد عبدالحق صاحب مرحوم ایک مقتدر رئیس صاحب نقد و جائداد اور ایک کشادہ دست انسان تھے، میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختار عام تھے فارسی میں اعلیٰ استعداد کے مالک تھے اور حافظ قرآن تو نہ تھے لیکن ناظرہ بہت قوی تھا، اور قران مجید بہت صحت سے پڑھتے تھے ذہنی اعتبار سے بڑے ہی صاحب فراست تھے جس کا ایک کھلا ثبوت یہ ہے کہ اپنے صاحبزادوں کی استعداد و صلاحیت کو بچپن ہی میں تاڑ گئے تھے، اور اسی بنا پر اپنے فرزند اکبر (یعنی حضرت مجدد الملت) کو عربی و دینیات میں اور فرزند اصغر اکبر علی صاحب مرحوم کو انگریزی اور علوم دنیوی میں لگا دیا تھا اور اس پر مرحوم کو پورا پورا اعتماد تھا ایک مرتبہ مرحوم کی بھاوج صاحبہ نے فرمایا ''بھائی تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کما کھائے گا، بڑا عربی پڑھ رہا ہے وہ کہاں سے کھائے گا اور اس کا گذارا کس طرح ہوگا کیونکہ جائداد تو ورثاء میں تقسیم ہو کر گذارے کے قابل نہ رہے گی'' اس پر مرحوم کو جوش آیا اور فرمانے لگے ''بھابی صاحبہ تم کہتی ہو کہ یہ عربی پڑھ کر کھائے گا کہاں سے خدا کی قسم جس

کوتم کھانے والا سمجھتی ہواس جیسے اس کی جوتیوں سے لگے لگے پھریں گے اور یہ ان کی جانب رخ بھی نہ کرے گا کس بلا کی فراست ہے اور مزاج شناسی یہی وجہ ہے کہ اکبر علی صاحب مرحوم سے کہیں زیادہ حضرت حکیم الامت پر روپیہ صرف کرتے تھے اور جب ایک مرتبہ بھاوج صاحبہ نے اس کی شکایت کی تو فرمایا ''بھابی مجھے اس (مجدد الملت) پر رحم آتا ہے وہ جو کچھ مجھ سے لیتا ہے میری زندگی تک ہے میرے بعد یاد رکھو وہ میرے مال ومتاع سے بالکل علیحدہ رہے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایک ایک قیاس حکیم الامتؒ کی آئندہ زندگی میں پیکر حقیقت بن کر جلوہ نما ہوا۔ حضرت حکیم الامت کی والدہ ماجدہ بھی ایک صاحبِ نسبت بی بی تھیں، حضرت حکیم الامتؒ کے ماموں پیر جی امداد علی صاحبؒ ایک زبردست صاحب حال وقال بزرگ تھے یہ اپنے وقت کے مجذوب کامل حافظ غلام مرتضٰی صاحب پانی پتی کے مشورہ سے حیدر آباد دکن تشریف لائے۔ یہاں ملازم بھی ہوئے اور بعد کو حضرت حافظ صاحبؒ ہی کے ایماں سے مرزا سردار بیگ صاحبؒ ارادت میں داخل ہو گئے، جنہوں نے نوابی وریاست کو ٹھکرا کر فقر و درویشی اختیار کر رکھی تھی، گو حضرت حکیم الامتؒ کو مسائل وحقائق میں ان سے اختلاف تھا، مگر ان کا جذبۂ عشق بہرحال قابل قدر تھا بقول حکیم الامت ان کے اشعار سے آگ برستی تھی چنانچہ ان کا یہ شعر حضرت اقدسؒ نے بارہا نقل فرمایا ہے ؎

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا

جب تو نے یہ مئے ظالم شیشے میں بھری ہوگی

حضرت کے نانا میر نجابت علی اعلیٰ درجہ کے فارسی داں انشاء پرداز اور حاضر جواب بزرگ تھے، مولینا شاہ نیاز احمد بریلویؒ کے ایک خلیفۂ خاص کے مرید اور حافظ غلام مرتضٰی صاحب سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔

حضرت اقدس کے جد اعلیٰ سلطان شہاب الدین فرخ شاہ کابلی تھے جن کی اولاد میں شیوخ تھانہ بھون کے علاوہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہٗ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ اور شیخ فرید الدین گنج شکرؒ جیسے کاملین ہوئے ہیں خود حضرت فرخ شاہ پہلے تو والی کابلی رہے اور سلطنت غزنویہ کے زوال پر جزبۂ جہاد کے تحت کئی بار ہندوستان پر حملہ کر کے کافروں کو زیر کیا اور بامراد لوٹے، جہاد اصغر سے فراغت پاکر جہاد اکبر میں مصروف ہو گئے کابل کے کوہسار کو اپنا نشیمن بنایا بزرگان چشت کے آگے زانوئے ارادت تہہ کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچے اور ایک عالم کو فیضیاب کیا اور پھر بعد وفات وہیں دفن ہوئے، یہ موضع آج تک ''درۂ فرخ شاہ'' کے نام سے مشہور اور زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

تا گو ہر آدم نسیم باز نہ استدا
زابائے خودار بشمر شمرم اصحابِ کرم را

ولادت اور بچپن

خاندان اشرف کا مجمل خاکہ نظروں میں آ گیا، ایسے عالی خاندان میں جہاں دولت وحشمت اور زہد وتقویٰ بغل گیر ہوتے تھے، حضرت مجدد الملت کی جامع شخصیت ظہور پذیر ہوئی ولادت کا واقعہ بھی عجیب ہے حضرت اقدس کے والد مرحوم کے اولاد نرینہ زندہ نہ رہتی تھی اس کی ظاہری وجہ یہ تھی کہ موصوف جب ایک مرتبہ مرض خارش میں بری طرح مبتلا تھے تو مجبوراً کسی ڈاکٹر کے مشورے سے ایسی دوا کھالی تھی جو قاطع نسل تھی، مگر جب اس کی خبر مرحوم کی خوش دامن صاحبہ کو پہنچی تو وہ سخت پریشان ہوئیں اور حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتیؒ سے عرض کیا کہ میری لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے ہیں حافظ صاحبؒ نے مجذوبانہ انداز میں فرمایا عمرؓ وعلیؓ کی کشاکش میں مرجاتے ہیں اب کی باری علیؓ کے سپرد کر دینا، اس معمہ کو کسی نے نہ سمجھا لیکن حکیم الامت کی والدہ تاڑ گئیں اور فرمایا حافظ صاحب کا یہ مطلب ہے کہ لڑکوں کی ددھیال ہے فاروقی اور ننھیال ہے علوی اور اب تک جو نام بھی رکھے گئے وہ ددھیالی طرز پر تھے اب کی بار جب لڑکا ہو تو ننھیالی وزن پر نام رکھا جائے جس کے آخر میں ''علی'' ہو حافظ صاحب یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا لڑکی بڑی ہوشیار ہے میرا منشاء یہی تھا، پھر فرمایا، ان شاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے، ایک کا نام **اشرف علی** رکھنا اور دوسرے کا **اکبر علی** ایک میرا ہوگا اور وہ

مولوی ہوگا، دوسرا دنیادار ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا، مجدد الملت ۵/ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو چہارشنبہ کے دن صبح صادق کی طلوع کے ساتھ جلوہ نما ہوئے۔

چونکہ حضرت کی ولادت کے چودہ ہی مہینے بعد آپ اکے چھوٹے بھائی اکبرعلی مرحوم کی ولادت ہوئی اور ماں کا دودھ بچوں کے لئے کافی نہ ہوتا تھا، اس لئے انا رکھی گئی پھر حضرت کی عمر شاید پانچ برس کی ہوئی تھی کہ مادری سایہ سر سے اٹھ گیا، مگر محبت مادری کا سیلاب شفقت پدری کے دریا میں ضم ہوکر اب اس راہ سے امنڈنے لگا، والد ماجد نے اپنے اس گوہر اشرف کی تربیت بڑے ہی پیار محبت سے کی اور تربیت میں اس کا خاص لحاظ رکھا کہ اس کی جلا میں کچھ فرق نہ آئے، تراویح میں ختم قرآن کے موقعہ پر جب مٹھائی بٹتی تو اس میں ہرگز شریک نہ ہونے دیتے بلکہ اس وقت خود بازار سے لاکر اپنے فرزند کو چھکا دیتے اور فرماتے کہ مسجد کی مٹھائی لینا بے غیرتی کی بات ہے۔ نوعمری میں ایک مرتبہ فرزند کی زبان سے مولانا رفیع الدین صاحب (مہتمم دارالعلوم) کے متعلق یہ نکل گیا ''مولانا تو پڑھے ہوئے نہیں ہیں'' بس اس سختی سے ڈانٹا کہ گویا اب مارنا ہی باقی تھا فرمایا کہ ''بزرگوں کی شان میں یوں نہیں کہا کرتے.......... حضرت اقدس.......... کی طبیعت خود ایسی واقع ہوئی تھی کہ کبھی بازاری لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن ہی سے حضرت کا مذاق دینی تھا، کھیلوں میں کبھی نماز باجماعت کی نقل اتارتے تھے، بازار کی طرف کبھی نکل جاتے اور راستہ میں مسجد نظر پڑتی تو سیدھے اندر چلے جاتے

اور ممبر پر چڑھ کر خطبہ کی طرح کچھ پڑھ پڑھا کر لوٹ آتے گویا مستقبل کے نقشہ کا خاکہ اس نیم شعوری دور ہی سے کھینچ رہے تھے۔

ابھی ۱۲/۱۳ برس ہی کی عمر ہوگی کہ ''فغان صبح گاہی'' کا چسکا لگا پچھلی رات سے اٹھ بیٹھتے اور تہجد وظائف میں منہمک ہو جاتے، والدہ تو تھیں نہیں تائی صاحبہ کا دل بہت دکھتا کہ اس نوعمری میں یہ مشقت لیکن عشق کی آگ تو بھڑک چکی تھی، اور حضرت کے استاذ مولانا فتح محمد صاحبؒ جیسے صاحب نسبت واجازت بزرگ کی صحبت نے اپنا اثر جما دیا تھا۔

نظافتِ طبع کا یہ عالم تھا کہ بچپن میں بھی کسی کا ننگا پیٹ دیکھتے تو قے کر دیتے تھے طبیعت کی اس لطافت سے بہت ستائے گئے بڑے ہو کر بھی یہ عالم رہا کہ جس کمرے میں تیز خوشبو ہوتی سو نہ سکتے تھے، ابتداء ہی سے بے اصولی نا قابل برداشت رہی اس وجہ سے حضرت والا کی بڑی اہلیہ محترمہ فرمایا کرتی تھی کہ آپ تو کسی بادشاہ کے ہاں پیدا ہوتے، حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانویؒ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے پیر بھائی اور حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ کے خلیفۂ خاص تھے حکیم الامت کے بچپن کے احوال و آثار ہی کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ ''میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا۔

حضرت حکیم الامت نے بچپن ہی میں ایک خواب دیکھا تھا جس سے پہلے کوئی خواب دیکھنا یاد نہیں، کہ بڑے مکان میں ایک پنجرہ رکھا ہوا ہے

جس میں دو خوبصورت کبوتر ہیں، پھر دیکھا کہ شام ہوئی اور تاریکی چھا گئی ان کبوتروں نے حضرت سے کہا کہ ''ہمارے پنجرہ میں روشنی کردو'' حضرت نے کہا کہ ''خود ہی کرلو'' چنانچہ انہوں نے اپنی چونچیں رگڑی اور ساتھ ہی ایک تیز روشنی ہوئی جس سے سارا پنجرہ منور ہو گیا، ایک مدت بعد جب حضرت نے اپنا یہ خواب ماموں واجد علی صاحبؒ مرحوم سے بیان کیا تو انہوں نے یہ تعبیر دی کہ وہ دو کبوتر روح نفس تھے انہوں نے تم سے درخواست کی کہ مجاہدہ کر کے ہم کو نورانی کردو مگر تم نے جو یہ کہا کہ تم خود ہی روشنی کرلو اور انہوں نے اپنی چونچ رگڑ کر روشنی کرلی اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شاء اللہ بلا ریاضت ہی حق تعالیٰ تمہاری روح اور نفس کو نور عرفاں سے منور فرمادیں گے، چنانچہ مستقبل میں یہ خواب حقیقت بن کر ظاہر ہوا۔

حصول علم

حضرت مجدد الملت کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی، فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھیں اور حافظ حسین علی صاحب مرحوم دہلوی سے کلام پاک حفظ کیا، پھر تھانہ بھون آکر حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ سے عربی کی ابتدائی کتابیں اور فارسی کی متوسط کتابیں پڑھیں، اور اس کی کچھ انتہائی کتابیں ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں جو ادب فارسی کے استاد کامل تھے، پھر دیوبند پہنچ کر بقیہ نصاب کی تکمیل مولانا منفعت علی صاحب سے کی اور زبان

فارسی میں پورا عبور حاصل کیا ایک مرتبہ اسی زمانۂ طالب علمی میں خارش میں مبتلا ہونے کی وجہ سے چھٹی لے کر گھر تشریف لائے تھے تو بطور مشغلہ اشعار پر مشتمل ایک مثنوی زیر و بم لکھی جس سے فارسی کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، اس وقت آپ کی عمر ۱۸ر برس سے زیادہ نہ تھی آخر ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور پانچ سال تک یہاں مشغول تعلیم رہ کر شروع ۱۳۰۱ھ میں فراغت حاصل کی اس وقت عمر شریف ۱۹ر۲۰ برس کے لگ بھگ تھی۔

زمانۂ طالب علمی میں حضرت طالب علمانہ میل جول سے الگ تھلگ رہے اگر کتابوں سے کچھ فرصت ملتی تو اپنے استاذ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ (صدر مدرس مدرسہ دار العلوم دیوبند) کی خدمت فیض درجت میں جا بیٹھے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو ہر فن میں ماہر ہونے کے ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کے خلیفۂ رشید بھی تھے ان کی اسی جامع حیثیت کی وجہ سے ان کا حلقہ درس حلقہ توجہ بھی ہوتا تھا اور ذہن و قلب کی تعلیم و تربیت ایک ساتھ ہوتی تھی افسوس! آج دینی درسگاہیں جامعیت فیض سے محروم ہیں .... حضرت والا کی ابتداء ہی کو دیکھ دیکھ کر اہل بصیرت انتہاء کا پتہ چلا چکے تھے۔

چنانچہ جب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ طلباء کا امتحان لینے اور دستار بندی کے لئے تشریف لائے تو شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے اپنے اس ہونہار طلب کی ذہانت و ذکاوت کی بطور خاص مدح فرمائی،

حضرت گنگوہیؒ نے مشکل سوالات کئے اور ان کے جواب سن سن کر مسرور ہوئے۔

حضرت اقدسؒ کوعلوم عقلیہ سے خاص مناسبت تھی، فطرت نے حاضر جوابی طلاقت لسانی اور ذہانت وفطانت کے جواہر سے پوری طرح آراستہ کیا تھا، منطق میں مہارت کا اعتراف یوں فرماتے تھے کہ میں سچی بات کیوں نہ کہوں، نہ میں متواضع ہوں نہ متکبر الحمدللہ مجھے منطق میں مہارت حاصل ہے۔ چنانچہ دیوبند میں جب کوئی مذہبی مناظرہ کے لئے آتا تو فوراً اشرفی تلوار خلوت کی نیام سے باہر نکل آتی اور مخالف کو گھائل کر جاتی تھی......لیکن طبیعت کے اعتدال کا یہ عالم تھا، کہ معقولات کو ہمیشہ دینیات کے لئے علوم آلیہ سمجھتے تھے آپ کی ہر تقریر وتحریر میں یہ جوہر نمایا نظر آتا ہے، رأس المناظرین مولانا سید مرتضٰی حسن صاحبؒ (استاذ دارالعلوم دیوبند) حضرت کی اسی نوعمری کی تقریروں پر وجد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ حضرت کوفن مناظرہ میں اس قدر کمال ہے کہ بڑے سے بڑا مناظر بھی ٹھیر نہیں سکتا، اور خود حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ''جتنا شوق مجھے اس زمانہ طالب علمی میں مناظرہ کا تھا، اب اس کی مضرتوں کی وجہ سے اتنی ہی نفرت ہے'' علومِ عقلیہ ونقلیہ میں اس قدر رسوخ رکھنے کے باوجود تواضع کا حال قابل دید ہے، ۱۳۰۱ھ کا واقعہ ہے خبر ملی کہ دستار بندی (تقسیم اسناد) کا جلسہ بڑے شاندار پیانے پر ہونے والا ہے اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کے مقدس ہاتھوں یہ رسم طے پانے والی ہے، اپنے ہم سبقوں کو

جمع کر کے اپنے استاذ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی حضرت ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی ہوگی اور سند فراغ دی جائے گی حالانکہ ہم ہرگز اس کے اہل نہیں یہ تجویز منسوخ فرمادی جائے ورنہ اس میں مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی ہے۔ یہ سن کر صاحب بصیرت استاذ کو جوش آیا فرمانے لگے تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس لئے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہئے، باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے باقی سارا میدان صاف ہے۔ ..... دنیا نے دیکھا کہ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فتویٰ نویسی کا کام بھی اسی زمانے سے آپ کے سپرد فرمایا تھا ایک مرتبہ آپ نے ایک طویل استفتاء کا ویسا ہی مفصل اور مکمل جواب لکھ کر اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کیا تو عارف کامل استاذ نے اس پر دستخط کرتے ہوئے فرمایا:

معلوم ہوتا ہے تم کو فرصت بہت ہے ہم تو اس وقت دیکھیں گے جب خطوں کا ڈھیر تمہارے سامنے ہوگا اور پھر تم اتنے لمبے لمبے جواب لکھو گے، آئندہ پتہ چلے گا بصیرت یعقوبی نے جو کچھ دیکھا کس قدر صحیح تھا، حق تعالیٰ نے مجدد الملت کو جہاں اور محاسن ظاہری سے نوازا تھا وہاں خوش الحانی سے بھی سرفراز فرمایا تھا، حضرت کی فن قرأت میں مہارت کے ساتھ حسن صوت نے

ملکر سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا حضرت نے قرأت کی مشق مشہور عالم قاری محمد عبداللہ صاحب مہاجر مکی سے بمقام مکہ معظمہ فرمائی تھی، جو قرائے عرب کے نزدیک بھی ایک ماہر فن قاری تھے، حضرت کی قوت اخذ کا یہ عالم تھا کہ جب شاگرد و استاذ قرأت کی مشق کرتے کراتے ہوتے تو پہچاننا مشکل ہوتا تھا، کہ استاذ پڑھ رہے ہیں یا شاگرد سنار ہے ہیں، کمال فن اور جمال صوت نے مل کر عجیب دلفریبی پیدا کر دی تھی، بقول شخصے: قرآن کیا پڑھتے تھے لوگوں کو ذبح کرتے تھے۔ایک مرتبہ نماز فجر میں مولانا عین القضاۃ صاحب (جنہوں نے لکھنؤ میں قرأت کا ایک اعلی مدرسہ قائم فرمایا تھا) شریک تھے حضرت کا قرآن سنا تو بعد نماز بہت اشتیاق سے کچھ اور سنانے کی خواہش ظاہر کی حضرت کی پذیر طبیعت کا نتیجہ یہ تھا کہ دار العلوم پہنچ کر تکلف اور معمولی باتوں کی طرف ضرورت سے زیادہ التفات سب کچھ رخصت ہو گیا تھا، سادی سی زندگی اور فقیرانہ رنگ اختیار کر لیا تھا، حضرت والاطلباء کے بناوسنگار اوران ادنی چیزوں کی طرف التفات سے نفور تھے اور فرماتے تھے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو علم کا چسکا لگا نہیں۔

درس وتدریس

تکمیل تعلیم کے بعداب وقت آتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی عام فضاء سے جو فیض حاصل کیا تھا اور استاذ خاص کی شفقتوں نے جس رنگ میں ڈبویا تھا اسی فیض کو عام کریں، اور اسی رنگ میں ایک ایک کو رنگ دیں............سبزہ کا آغاز ہے، حسن ظاہری اور جمالِ باطنی سے آراستہ ہیں کمالِ علمی اور جذبۂ اشاعت دین سے معمور ہیں حق تعالیٰ کے محبوب ہیں، بلا کی کشش ومقناطیس ہے، جہاں بھی بیٹھ گئے لوگ پروانہ وار آئے، اور ساری فضاء انہی کے رنگ میں رنگ گئی۔

شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بتا رہے ہیں[1]

مسلسل ۱۴ بر س تک اسی انداز سے درس وتدریس میں مشغول رہے اور ساتھ ہی مواعظ، تصنیفات اور افتاء کے کام سے ایک عالم کو فیضیاب کیا......کانپور میں ایک مدرسہ قدیم سے چلا آرہا تھا جو مدرسہ فیض عام کے نام سے مشہور تھا اس کی صدر مدرسی کے لئے جب حضرت کو کانپور والوں نے طلب کیا تو اپنے اساتذہ اور والد ماجد کی اجازت سے صفر ۱۳۰۱ھ میں (۲۵) روپیہ

---

[1]

ماہوار پر یہاں تشریف لے آئے نوجوان تھے لیکن بہت جلد وہاں کے سارے مدرسین میں آپ کے علم وفضل کا شہرہ ہوگیا۔

ادھر درس تدریس سے طلباء وعلماء گھائل ہوئے اُدھر مواعظ حسنہ نے سارے کانپور کو حضرت کا فریفتہ بنا دیا، یہ سب کچھ تین چار مہینے میں ہوا، اراکین مدرسہ نے حضرت اقدس کی اس مقبولیت سے مالی فائدہ حاصل کرنا چاہا اور وعظوں میں مدرسے کے لئے چندوں کی اپیل کرنے کی خواہش کی، حضرت والا چونکہ اس قسم کے چندوں کو شرعاً ناجائز اور ویسے غیرت دینی کے بھی خلاف سمجھتے تھے، اس لئے ان اراکین کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی، اس پر ان میں کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں حضرت نے اس کی اطلاع پا کر استعفیٰ پیش کر دیا اور باوجود اصرر کے پھر اس مدرسہ میں رہنا گوارا نہ کیا، بلکہ واپسی وطن کا ارادہ فرمالیا، مگر واپسی سے پہلے حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی خدمت فیض درجت[1] میں حاضر ہوئے کہ شاید پھر اس کا موقع نہ ملے، حضرت تشریف لے گئے اور اُدھر کانپور کے لوگوں میں اس نقصان عظیم سے ایک ہیجان بپا ہوا، جناب عبدالرحمٰن خانصاحب اور کفایت اللہ صاحب مرحوم نے یہ سوچ کر کہ ایسی جامع شخصیت جو معقولات ودینیات پر حاوی ہو نایاب ہے، اپنی طرف سے (۲۵) روپیہ تنخواہ کی سبیل کر کے مرادآباد سے واپسی پر حضرت اقدس کو روک لیا اور اب حضرت اقدس جامع مسجد محلہ پٹکاپور میں درس دینے

[1] فیض درجت، فیض رکھنے والا۔ (ناشر)

لگے اس طرح ایک نئے مدرسے کی بناء پڑی جس کا نام خود حضرت ہی نے مسجد کی مناسبت سے ''جامع العلوم'' رکھا جو آج تک قائم ہے، غرض پورے ۱۴ سالہ قیام کے بعد خود اپنے مرشد شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کے ارشاد پر آخر صفر ۱۳۱۵ھ میں کانپور کا تعلق ترک کر کے تھانہ بھون کو رونق بخشی، اس مرجعت پر حضرت حاجی صاحبؒ ایک والا نامہ تحریر فرماتے ہیں۔

بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے امید ہے کہ خلائق کثیر کو آپ سے فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سر نو آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں (مکتوبات امدادیہ)

حضرت کو ابتداء سے لے کر آخر عمر تک طلبہ سے خاص محبت رہی اور ان کا خاص لحاظ فرماتے رہے، خود اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم کہتے رہے فرمایا کرتے تھے کہ ''مجھے پیر جیوں والی درویشی نہیں آتی''، میں تو ایک طالب علم ہوں مجھ سے تو قرآن وحدیث کی باتیں پوچھی جائیں مجھے تو سادہ سیدھا قرآن وحدیث ہی آتا ہے اور اسی کو اصل درویشی سمجھتا ہوں، اور فرماتے کہ ''صوفیا سے زیادہ علماء کی ضرورت ہے کیونکہ انہی کی بدولت انتظام دین قائم ہے'' اسی وقعت علمی کا نتیجہ تھا کہ طلباء کے ساتھ ہر طرح کی رعایت فرماتے اور ان کی ہر طرح امداد کرتے تھے اُن کے وقار کا خاص لحاظ رکھتے اور دوسروں کو اس کی تاکید فرماتے تھے، اور خود طلباء کو ادنی چیزوں کی طرف سے موڑ کر ان کے مقام اعلیٰ اور منصب جلیل پر فائز کرنے کی پوری سعی فرماتے تھے۔

اصول تعلیم

اب آیئے اس ہستی کے اصول تعلیم کو اجمالی طور پر سمجھیں جس کی چودہ سالہ تدریس میں سینکڑوں علماء کامل نکلے:

(۱) حضرت والا اس بات کے قائل تھے کہ استاذ جو بھی مضمون پڑھائے اس میں خود زیادہ مشقت اٹھائے اور اس کو سہل ترین پیرایہ میں شاگردوں کے آگے پیش کرے گو اس میں استاذ پر زیادہ بار پڑتا ہے لیکن جذبۂ شفقت اس کو ہلکا کردیتا ہے اور سچ یہ ہے کہ بغیر اس جذبہ کے یہ کام انجام ہی نہیں پاسکتا۔

(۲) حضرت اقدس کا یہ بھی اصول تھا کہ مشکل اور پیچیدہ مقام کو پہلے سلیس تقریر میں حل کیا جائے اور جب طلباء خوب سمجھ لیں تو اس مقام کا تعارف کرایا جائے۔ چنانچہ مدرسہ ''جامع العلوم'' کے شاگرد اول مولوی فضل حق صاحب (جو بعد میں مدرسہ قنوج میں مدرس بنے) کو صدرا کا مشہور مقام مثناۃ بالتکریر در پیش ہوا، جو بہت ہی مشکل سمجھا جاتا ہے، تو حضرت نے پہلے اس کی آسان تقریر فرمادی اور پھر جب وہ اچھی طرح سمجھ گئے تو فرمایا کہ ''یہ وہی تو مقام تھا جس کو مثناۃ بالتکریر کہتے ہیں'' اس پر وہ دنگ رہ گئے کہ ہم تو بہت ڈرتے تھے لیکن یہ تو کچھ مشکل نہ نکلا۔

(۳) حضرت اقدس یہ بھی پسند نہ فرماتے تھے کہ طلباء کے آگے زائد ازضرورت تقریر کی جائے جس سے مقصود محض اظہارِ قابلیت ہو اور جس کی وجہ سے اصل مطلب خلط ملط ہو جائے چنانچہ نہ صرف خود اس اصول پر کاربند تھے بلکہ اور مدرسین پر بھی اسی نظر سے نگرانی فرماتے تھے۔

(۴) ہفتہ واری تقریروں اور مناظروں (ڈبیٹ) سے بھی حضرت کو اختلاف تھا اور بجا اختلاف فرماتے تھے کہ اس کی وجہ سے طلبہ کی توجہ ہفتہ بھر اسی ایک موضوع پر تقریر و بحث کی طرف لگی رہتی ہے اور اصل درس میں حرج واقع ہوتا ہے حضرت اقدسؒ فرماتے تھے کہ جب کتابیں اچھی طرح پڑھ لیں تو پھر تقریر مناظرہ سب کچھ آ جاتا ہے حضرت اقدس کی طالب علمانہ یکسو زندگی اور بعد کی رہنمایانہ زندگی اس صحیح اصول کی کھلی گواہ ہے۔

(۵) فرماتے ہیں کہ طلبہ اگر تین باتوں کا التزام کریں تو استعداد علمی حاصل ہو جاتی ہے۔

(ا) آئندہ سبق کا مطالعہ کر کے معلومات اور مجہولات میں تمیز پیدا کریں۔

(ب) پھر جب استاذ سمجھائے تو بغیر سمجھے آگے نہ بڑھیں۔

(ج) جب سمجھ چکیں تو ایک مرتبہ خود بھی اسی مطلب کی تقریر کریں، یہ تین باتیں تو واجب ہیں ایک بات درجۂ استحباب کی ہے وہ یہ کہ کچھ آموختہ روزانہ پڑھ لیا کریں، اب یاد رہے نہ رہے استعداد ان شاء اللہ

پیدا ہو جائے گی۔

(۶) حضرت والا نے یہ اصول بنایا تھا کہ اگر کوئی طالب علم عدمِ مناسبت یا عدم دلچسپی کی وجہ سے معقولات نہ پڑھے لیکن دینیات کی درسی کتابیں تمام کرے، تو اس کو سنار سے محروم نہ رکھا جائے بلکہ سند میں بجائے ''درسیات کے (جو معقولات و دینیات کی جملہ کتب پر عادی ہے) ''دینیات'' لکھا جائے۔

بزرگانِ عصر کی خدمت میں

حضرت قدس رحمۃ اللہ علیہ کو حضرات اہل اللہ سے خاص عقیدت اور محبت تھی، فرماتے تھے کہ ان بزرگوں کے ناموں سے بھی روح میں تازگی اور قلب میں نور پیدا ہوتا ہے، بزرگوں کے تذکرہ کو اس وجہ سے نافع سمجھتے تھے کہ ''نزہۃ البساطین'' کے نام سے ایک ہزار حکایات جمع کر کے شائع کرا دیا اور بہت وثوق سے فرماتے تھے کہ یہ حضرات عشاق تھے، ممکن نہیں کہ ان کے حلات پڑھے جائیں اور قلب میں محبت الٰہی پیدا نہ ہو، خود اپنے متعلق بارہا فرمایا کہ ''نہ کبھی طالب علمی میں میں نے محنت کی نہ اس طریق میں کبھی مجاہدات و ریاضات کیے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے سب اپنی حضرات اساتذہ و مشائخ کی دعا و توجہ اور میری طرف سے غایت درجہ ادب و عقیدت کا

ثمرہ ہے'' بالخصوص اس وقت جب حضرت اقدس اپنے شفیق اساتذہ کے کملات ان کی علمی تحقیقات اور باطنی کیفیات کا ذکر فرماتے تو آپ پر ایک وجہ کی سی کیفیت طاری رہتی تھی اور دیر تک یہی حال قائم رہتا تھا پھر یہ شعر پڑھتے: اولئک آبائی فجئنی بمثلھم اذا جمعنا حضرت اقدس اپنے وقت کے سارے بزرگان دین سے ملے ہیں اور ہر ایک سے دعا و توجہ لطف عنایت کے ذریعہ استفادہ کیا ہے۔

تمتع زہر گوشہ یا ختم، چنانچہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ مجددی مہتمم مدرسہ دیوبند کے حلقہ توجہ میں شریک رہے ہیں اور فرماتے تھے کہ ''اس قدر اثر محسوس ہوتا تھا جیسے بالکل پاک صاف ہو گیا ہوں، مولانا قدس سرہٗ کے ساتھ حضرت نے سرہند پہنچ کر شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے مزار کی زیارت فرمائی، اور واپسی میں زیارت پٹیالہ میں ان مقامات کی زیارت کا شرف ملا جہاں (بر بنائے کشف) بعض حضرات انبیاء علیہم السلام کے مزارات ہیں مولانا قدس سرہٗ کو حضرت سے اس درجہ محبت تھی کہ مدتوں آپ سے اپنی مسجد میں امامت کروائی اسی طرح آپ شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی اور شاہ ابو حامد صاحب بھوپالیؒ (جو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے آفتاب تھے) کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے ہیں اور ہر دو بزرگان عصر نے خاص برتاؤ فرمایا ہے اول الذکر بزرگ سے تو اس درجہ محبت بڑھی کہ انہوں نے آپ کو اپنے وہ احوال بھی سنائے

جو اوروں سے بیان نہ فرماتے تھے، مثلاً فرمایا کہ'' کہنے کی تو بات نہیں لیکن تم سے کہتا ہوں کہ جب سجدہ میں جاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے پیار کرلیا یہ بھی فرمایا کہ'' بھائی جنت کا مزہ برحق کوثر کا مزہ برحق لیکن نماز میں جو مزہ ہے کسی چیز میں نہیں بھائی ہم تو قبر میں بس نماز پڑھا کریں گے دعا ہے کہ ہمیں اللہ میاں قبر میں اجازت دیں کے بس نماز پڑھے جاؤ۔

صوفی شاہ سلیمان صاحبؒ لاجپوری ایک مشہور بزرگ ہوئے ہیں، خود ان بزرگ نے حضرت سے کئی بار ملاقات فرمائی ایک مرتبہ حضرت راندیر سے سورت جارہے تھے اور صوفی صاحب سورت سے راندیر راستہ میں ایک پل پر دونوں کی ملاقات ہوئی صوفی صاحبؒ راندیر پہنچ کر دیر تک ایک مسجد میں بیٹھے روتے رہے اور کسی کے استفسار پر حضرت کا نام لیکر فرمایا کہ'' نہ جانے آنکھوں سے کیا کر گئے'' حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ تھانوی (جو ایک جید عالم اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے پیر بھائی تھے) لڑکپن ہی میں جب حضرت کو دیکھا تو فرمادیا تھا میرے بعد یہ لڑکا ہوگا، چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہی ہوا مولانا محمد یعقوب صاحبؒ قدس سرہٗ نے تو (جو مدرسہ دیوبند کے مدرسِ اول حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفۂ رشید اور حضرت کے استاذ تھے) آپ نے شاگرد کو خوب دیکھا تھا آپ کے زمانۂ طالب علمی ہی میں حضرت قدس سرہٗ نے یہ فرمادیا تھا خدا کی قسم جہاں تم جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے، سچ ہے قلندر

ہر چہ گوید دیدہ گودی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے دنیائے
اسلام ناواقف نہیں اپنے وقت کے محقق عالِم اور اہل دل کے نزدیک مسلمہ طور
پر قطب ارشاد تھے، چونکہ اولاحضرت نے آپ ہی سے بیعت کی درخواست کی
تھی اس لئے تا آخر حیات آپ کے ساتھ شیخ ہی کا سلوک فرماتے رہے، اور
واقعی حضرت کو آپ سے بڑی عقیدت ومحبت تھی فرماتے تھے ''میں نے ایسا
جامع ظاہر و باطن بزرگ کوئی نہیں دیکھا اور لوگوں کے ساتھ تو میری عقیدت
استدلالی ہے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ساتھ غیر استدلالی دلائل سوچنا بھی
خلافِ ادب سا معلوم ہوتا ہے'' قیام تھانہ بھون کے وقت حضرت تھانویؒ کے
مواعظ ومشاغل کا حال سنکر بہت خوش ہوتے اور فرمایا کرتے تھے ''یہ سب کچھ
ہے مگر مجھے تو پوری خوشی تو اس وقت ہوگی جب کچھ اللہ اللہ کرنے والے بھی
وہاں جمع ہونے لگیں، حق تعالیٰ نے اپنے اس محبوب بندہ کی آرزو بھی پوری کر
دکھائی اور خوب ہی پوری فرمائی شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے آج کا ہر
مسلمان واقف ہے حضرت رشید احمد گنگوہی کے خلیفۂ خاص اور بانی دار العلوم
حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کے شاگرد خاص تھے ہمارے حضرت کے استاذ
تھے اور اپنے شاگرد کا اس درجہ احترام فرماتے تھے کہ سراپا فضل وکمال اور
معدنِ حسنات وخیرات کے عنوانات سے مخاطب کرتے تھے............شیخ الہندؒ
اور حضرت میں جو سیاسی اختلاف رائے رہا ہے وہ عالم آشکار ہے بعض

بدخواہوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر حضرت شیخ الہند کو آپ سے برگشتہ کرانا چاہا تو آپ نے جواب دیا ''افسوس تم ایسے شخص کی شکایتیں کرتے ہو جس کو میں ایسا ایسا (مجدد الملت نے از راہِ تواضع وہ الفاظ نہیں بتائے) سمجھتا ہوں میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا مجھ پر کوئی وحی آئی ہے میری ایک رائے ہے اور ان کی ایک رائے اس میں اعتراض وشکایت کی کیا بات ہے'' اسی دور کے ایک اور بزرگ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ ہیں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے خلیفہ اعظم اور علم وعمل میں اپنی نظیر آپ تھے، حضرت تھانوی کے متعلق فرماتے تھے مجھکو اشرف سے اس وقت سے محبت ہے جس وقت ان کو خبر بھی نہ تھی، آپ کے مواعظ کے متعلق یہ رائے رکھتے تھے، ان کے بیان میں (مراد مواعظ) انگلی رکھنے تک کی گنجائش نہیں ان کے ہوتے ہوئے کسی کا وعظ کہنا منہ چڑاتا ہے۔

یہ تو ان چند بزرگوں کا بالکل اجمالی تذکرہ ہوا جو مطلع شہرت کے درخشندہ ستارے ہیں ان کے علاوہ اوراکابر وقت مثلاً مولانا عبدالحق صاحبؒ فرنگی محل مولانا محمد نعیم صاحبؒ فرنگی محلی، مولانا خلیل پاشا صاحب مکی قدس سرہٗ اور دیگر بیسیوں بزرگان دین سے ملاقاتیں رہی ہیں اور حضرت نے ان کے لطف وکرم کو اپنی جانب مبذول کرایا ہے اور وہ حضرت کے علم واخلاص سے متأثر ہوئے ہیں.........اہل حق میں یہ قبولیت اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔

ذلک فضل اللہ یؤ تیہ من یشاء .

شیخ دوراں سے تعلق اور حج بیت اللہ

گذر چکا کہ مجدد الملت کی پیدائش ایک مجذوب حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحبؒ کی دعاؤں کا نتیجہ تھی اور انہی بزرگ نے آپ کا نام ''اشرف علی'' رکھا تھا، اور آخر وقت تک اپنی محبت وتوجہ سے سرفراز کرتے رہے، یہی وجہ تھی کہ غیر شعوری طور پر حضرت میں عشق کی جلوہ آرائیاں پائی جاتی تھیں، ایک بار قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کسی ضرورت سے دیو بند تشریف لائے تو حضرت ایک ہی نظر میں گھائل ہوگئے، اشتیاق سے مصافحہ کے لیے آگے بڑھے، شوق نے بے قابو کر دیا تھا، پاؤں بے اختیار پھسل پڑا، حضرت اقدس سرہ نے تھام لیا، گو بیعت اور اس کی حقیقت سے نا آشنا تھے، مگر کشش اس بلا کی ہوئی کہ بیعت کی درخواست پیش کر دی، حضرت قدس سرہ نے دورانِ تعلیم اس کو مناسب نہ سمجھا اور انکار فرما دیا، لیکن خاطر اشرف میں یہ خیال بصورت حسرت برابر پرورش پاتا رہا اور جب ۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا گنگوہی عازم حج ہوئے تو خود انہی کے ذریعہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں عریضہ گذارا تاکہ ''آپ مولانا سے فرما دیں کہ مجھ کو بیعت کر لیں''۔ نہ جانیں دونوں عرفاء میں کیا راز و نیاز رہا، بظاہر یہی ہوا کہ حضرت حاجی صاحبؒ قدس سرہ نے جواب میں خود ہی

بیعت فرمالیا، اس وقت مجدد الملت کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔

حضرت مجدد الملت تو ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے کہ شیخ العرب والعجم قدس سرہ نے مکہ معظّمہ کی سکونت حاصل کر لی تھی، لیکن جب بصیرت کی آنکھ کھل جاتی ہے تو زمان و مکان کے سارے حجابات اُٹھ جاتے ہیں، عارف باللہ حضرت حاجی صاحبؒ نے وہیں سے تھانہ بھون کے اس درِ شہسواء کا جلوہ دیکھ لیا تھا، ابھی طالب علم ہی تھے کہ حضرت قدس سرہ نے آپ کے والد ماجد کو کہلا بھیجا تھا کہ ''تم حج کو آؤ اور جب آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو لیتے آؤ۔

غرض شوال ۱۳۰۱ھ میں جبکہ مجدد الملت طالب علمی کی زندگی ختم فرما کر کانپور میں اشاعت علوم میں مصروف تھے، سفر حج کے سامان پیدا ہو گئے (تفصیل کے لئے دیکھو اشرف السوانح) حضرت والا اپنے والد ماجد کی معیت میں زیارت حرمین شریفین کے لئے روانہ ہوئے جوش کا یہ عالم تھا کہ کب کسی ملاقاتی نے آپ کے والد ماجد سے سمندر کے طلاطم کا ذکر کیا تو فوراً کہہ اٹھے ؎

چہ غم دیوارِ امت را کہ باشد چوں کشتی باں

چہ باک از موجِ بحراں را کہ وارد نوح کشتی باں

اسی جذبۂ اشتیاق سے مکہ معظّمہ پہنچے، حضرت حاجی صاحب سے نیاز حاصل کیا، شیخ قدس سرہٗ بہت خوش ہوئے اور دست بدست بیعت کی نعمت سے سرفراز کیا، بعد فراغ حج خود فرمایا'' کہ تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ''

لیکن حضرت والا کے والد ماجد نے مفارقت گوارا نہ کی اور حضرت حاجی صاحبؒ نے بر بنائے احترام شریعت فرمایا کہ "والد کی اطاعت مقدم ہے اس وقت چلے جاؤ، پھر دیکھا جائے گا۔

چنانچہ بیس سالہ عمر میں پہلی بار فریضۂ حج سے فارغ ہوکر ۱۳۰۲ھ میں ہندوستان لوٹ آئے دوران قیام مکہ معظمہ حضرت والا پر ارض پاک کا احترام وادب اس درجہ غالب رہا کہ وہاں تھوکتے ہوئے بھی تامل ہوتا تھا اور جس وقت بیت اللہ شریف پر پہلی بار نظر پڑی ہے ایسی کیفیت شوقیہ وانجذابیہ پیدا ہوئی کہ خود فرماتے تھے، ایسی کیفیت مجھ پر عمر بھر طاری نہیں ہوئی۔

حج ثانی اور صحبت شیخ

عشق کی چنگاری تو پہلے ہی سے موجود تھی، حضرت حاجی صاحبؒ کے تعلق نے اس کو خوب ہوادی اور ارض پاک کے قیام نے اس کو خوب بھڑکایا لیکن واپسی پر پھر بھی اس شعلہ میں سوختہ سامانی کی صفت نہ آتی تھی برابر مصروف درس وتدریس اور مشغول تقریر وتحریر رہے سینکڑوں کو عالم بنایا، اور ہزاروں کے دل میں دین کی عظمت بٹھائی اور اس کا سکہ جمایا.........ادھر شیخ کامل سے خط وکتابت برابر جاری تھی۔ اور توجہات شیخ برابر شامل حال تھی، اندر ہی اندر آگ بھڑک رہی تھی ان احوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ۱۳۰۷ھ سے زندگی نے دوسرا پلٹا کھایا باطنی شغل سے اس درجہ دلچسپی بڑھی کہ سارے تعلقات سے دل

سرد ہو گیا۔ اپنے شیخ سے ترک ملازمت کا مشورہ لیا مگر جواب ملا کہ:

''نامہ بہجت شمامہ آں عزیز باتمیز رسید از سماعِ حال ذوق وشوق آثار ترقی فہمید مسرت برمسرت افزود آن حق تعالیٰ برکت زیادہ کند، بہ خلق اللہ فیض دینی رسانیدن راہ قرب وصول الی اللہ است''۔ (مکتوبات ۴/۲۲ محرم ۱۳۰۸ھ)

حضرت اقدس نے حسب ارشاد مرشد درس وتدریس کو جاری رکھا اور ۱۳۱۰ھ تک ضبط وسکون کے ساتھ کام کرتے رہے لیکن اب شوق واضطراب نے مجبور کر دیا اور اپنے شیخ کا وہ ارشاد کہ ''میاں اشرف علی تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ'' کسی پہلو چین نہ لینے دیتا تھا، عزم فرمایا اور راہ کھل گئی پھر کیا تھا مکہ معظمہ کو چل نکلے، عجب ذوق وشوق کا عالم تھا۔

قطب عالم حضرت حاجی صاحبؒ تو چاہتے ہی تھے کہ چھ مہینے کے لئے حضرت والا آجائیں دیکھ کر اس درجہ مسرور ہوئے گویا حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسفؑ گم گشتہ پھر ہاتھ آگئے اور بہت ہی عنایات وتوجہات فرماتے رہے ادھر قوتِ افاضہ کا وہ حال اور اُدھر قابلیت استفاضہ اس درجہ کچھ ہی عرصہ میں شاگرد واستاذ مریدوں پیر ہم رنگ ہو گئے خود حضرت شیخ بے ساختہ یہ فرماتے تھے کہ بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔ جب مجدد الملت کی کوئی تحریر نظر سے گزرتی یا تقریر سننے میں آتی یو بے اختیار کہہ اٹھتے، جزاکم اللہ۔ تم نے تو بس میرے سینے کی شرح کر دی، علوم معارف سے متعلق کو پوچھتا تو مجدد

الملت کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ان سے پوچھ لو یہ خوب سمجھ گئے ہیں۔

باطنی مناسبت تو پیدا ہی ہو چکی تھی حضرت شیخ ظاہری مناسبت کے بھی آرزومند تھے، مجدد الملت کے دوران قیام مکہ میں آپ کی زوجہ محترمہ اور خالہ صاحبہ بھی وہاں پہنچ گئی تھیں خالہ صاحبہ نے خدمتِ شیخ میں عرض کیا کہ "ان کے لئے صاحب اولاد ہونے کی دعا فرمایئے" حضرت شیخ نے اپنے مرید رشید سے باہر آ کر فرمایا "تمہاری خالہ مجھ سے دعا کے لئے کہتی ہیں کہ تمہارے اولاد ہوں" سو دعا تو میں نے کر دی لیکن بھائی میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ویسے ہی تم بھی رہو، جو حالت میری ہے وہی حالت تمہاری بھی رہے۔ مجدد الملت نے عرض کیا "جو حالت حضرت کو پسند ہے وہی میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں" یہ سن کر حضرت حاجی صاحبؒ بڑے مسرور ہوئے کہ ہر اعتبار سے اپنا جانشین مل گیا.......... اس سے قطب عالم قدس سرہٗ کے اس جذبہ کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے قلب اطہر میں مجدد الملت کا کس درجہ لحاظ تھا، اور کس طرح اس امر میں پوری قوت صرف فرمادی تھی کہ وہ آپ کے مثنیٰ بن جائیں اور کبھی دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ "من دیگرم تو دیگری" یہ اختصاص کسی اور مرید یا کسی اور خلیفہ کے حصہ میں نہیں آیا.......... دورانِ قیام مکہ معظمہ مجدد الملت پر "توحید" کا انکشاف بدرجۂ کمال ہوا جو شریعت وطریقت کی اساس اور درویشی کا ماحصل ہے اور جس کا لازمی نتیجہ "عبدیت" ہے جو سلوک کا اعلیٰ

ترین مقام ہے، اور یہی وہ دولت ہے جو حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کا خاص حصہ تھی..........غرض چھ مہینے سے ایک آدھ ہفتہ کم قیام کے بعد مجدد الملت نے اپنے شیخ کامل سے رخصت چاہی حضرت شیخ نے دو وصیتیں بطور خاص فرمائیں:

(۱) دیکھو میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی عجلت مت کرنا۔

(۲) کبھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا توکل بخدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا (گویا ۱۳۰۸ھ میں جس ترک تعلق کو منع فرمایا تھا اب بعد حصول "تمکین" خود اس کے ترک کا مشورہ دے رہے ہیں) ان وصیتوں اور باطنی دولتوں کو لے کر حضرت مجدد الملت ۱۳۱۱ھ میں پھر وطن لوٹ آئے۔

واپسی اور قیام وطن

مکہ معظمہ گئے تھے اس حالت سے کہ شباب پھٹا پڑتا تھا اور دولھا سے بنے رہتے تھے اور شش ماہا قیام کے بعد جب لوٹے ہیں تو عشق کے ہاتھوں وہی حال ہو گیا تھا جس کا اظہار زمانۂ طالب علمی میں خود ہی یوں فرما چکے تھے۔

عشق می سازد زمال وجاں جدا
عاشقاں رانیست مطلوب جز خدا

عشق عاشق راکند زارد نزار
عشق عاشق راکند رسوا وخوار
عشق سازد زرد روئے عاشقاں
ہم کند ژولیدہ سوئے عاشقان
عشق معشوق ست مرعشاق را
سن لہوب العشق ہم قالو ابلیٰ

کانپور میں ۱۳۱۵ھ تک قیام

ہندوستان پہنچ کر پھر مدرسہ جامع العلوم کانپور میں مصروف درس وتدریس ہوئے مگر کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ پھر کیفیت ''شوقیہ الہیہ'' نہایت جوش وخروش سے وارد ہوئی، لیکن اب کی دفعہ اس میں کلفت کے عوض لذت اور ناگواری کے بدلے خوشگواری تھی، حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری سے قبل کی کیفیت شوقیہ، سیر الی اللہ کا نتیجہ تھی اور موجودہ کیفیت سیر فی اللہ کے باعث تھی وہ حالت مشاہدہ سے قبل کی تھی اور یہ بعد کی، وہ اثر عشق تھا یہ اثر حسن، بقول حضرت مجدد الملت اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو ذاکر وشاغل اور ولی کامل بنادوں چنانچہ شروع شروع جوش افاضہ سے حلقۂ توجہ بھی منعقد فرمانے لگے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ سارا مدرسۂ کانپور ذاکر وشاغل بن گیا تھا اس کی اطلاع جب حضرت شیخ کو ہوئی تو جواب آیا

''ماشاء اللہ آپ اور آپ کے متعلقین کے ذوق شوق کی کیفیت سن کر طبیعت نہایت ہی خوش ہوئی۔

اللہ تعالیٰ بایں ذکر وشغل دائم مشغول رکھے، دن بدن ترقی درترقی عطا فرمائے، مقصود اصلی تک پہنچائے آمین، ثم آمین۔ لیکن یہ کیفیت بھی عارضی نکلی اور جب ''مقامات میں رسوخ بڑھتا گیا تو اس ''شوق'' نے دوسرا ہی رنگ اختیار کیا یعنی متوقع مقامات کی طلب شدید ہوئی اور پھر ویسی ہی اضطرابی اور التہابی کیفیت رونما ہوئی جیسی قبل قیام مکہ ہوئی تھی، لیکن دونوں کی اصل میں زمین آسمان کا فرق تھا پہلی کیفیت طلب ابتدائی کا نتیجہ تھی اور موجودہ کیفیت ''طلب مزید'' کا اور اسی وجہ سے اب کی دفعہ حیرانی و پریشانی اور سخت لاحق ہوئی، یہ وہی کیفیت تھی جس کی پیشین گوئی حضرت شیخ نے اپنی پہلی وصیت میں فرمائی تھی سارے مشاغل سے دل اُچاٹ ہوگیا، درس وتدریس سے دلچسپی ختم ہوئی۔ وعظ کہنا چھوڑ دیا، اور یکسوئی اختیار کرلی، اہل کانپور جو مجدد الملت کے وعظ کے پیاسے تھے مچلنے لگے، ایک دفعہ بڑا جلسہ تھا، بیرونی حضرات علماء بھی تشریف لائے تھے اراکین مدرسہ ان علماء کو لے کر حضرت کی خدمت میں آئے اور وعظ کے لیے اصرار کیا اکابر علماء کو دیکھ کر نہ انکار بن پڑتا تھا نہ اپنی حالت کے مدنظر اقرار ممکن تھا جب کچھ بن نہ پڑا تو گردن جھکالی، اور آنسوؤں کی زبانی اپنا حال سنانے لگے، یہ دیکھ کر مولانا ظہور الاسلام فتح پوری کا دل

پگھل گیا اور بے ساختہ یہ شعر زبان سے نکلا۔

عشق نے غالب نکمہ کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اپنے ساتھیوں سے کہا "بس بھائی بس اب انھیں اپنے حال پر چھوڑ دو، تنگ نہ کرو" ایک اور موقع پر جناب مولوی شاہ سلیمان صاحبؒ پھلواری تشریف لائے ہوئے تھے، ان سے بھی لوگوں نے اصرار کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے عجیب جواب دیا "اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوایا تو بس ممبر پر بیٹھتے ہی اس کے منہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا وہ "انا الحق" ہوگا، ایسی حالت میں اصرار ہرگز مناسب نہیں" اس کی تصدیق خود حضرت نے بھی فرمائی کہ "اس زمانہ میں مجھ پر توحید کا بہت غلبہ تھا، اس لیے میں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ نہ جانے منہ سے کیا نکل جائے، اور عوام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچے" مگر اس غلبۂ حال میں بھی مصلحت عامہ کا یہ خیال نادرات سے ہے۔ غرض یہ کیفیت اضطراب بڑھتی ہی چلی گئی، پیر جی امداد علی صاحب کانپور ہی میں تھے اور موصوف نے بہتری تدبیر کی مگر ۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر جب اضطراب والتہاب حد سے گذرنے لگا تو ایک عریضہ اپنے شیخ عالی مرتبت کی خدمت میں بھجوایا اور اس میں عرض کیا کہ حالت اضطرار میں پیر جی امداد علی صاحب سے بھی چارہ جوئی کی لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔ جب

یہ عریضہ شیخ باکمال قدس سرہ کی خدمت میں پہنچا تو حضرت حاجی صاحب کبھی گھر کے اندر تشریف لے جاتے کبھی باہر نکل آتے، اور بار بار فرماتے کہ ''جوان آدمی ہیں، غلبہ ہو گیا ہے، تحمل نہیں ہو سکا، مگر میں تو اتنی دور ہوں کیا کروں''۔

اس پر جو صاحب عریضہ لے گئے تھے انھوں نے عرض کیا کہ حضرت میں جلد ہی جانے والا ہوں، بس یہ سن کر حضرت قطب عالم مسرور ہوئے اس عریضہ کا جواب ان کے حوالہ کیا، اور فرمایا کہ ان سے کہنا کہ ''جب تک تمہارا یہ خادم زندہ ہے کیوں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہو''۔

جب یہ صاحب ہندوستان لوٹے اور حضرت مجدد الملت کو ان کے کانپور آنے کی اطلاع ملی تو مشتاقانہ عین دوپہری کے وقت ان کے گھر پہنچے، انھوں نے والا نامہ پہنچایا اور زبانی پیام بھی۔ اس سے جو اثر ہو، اس کا حال خود حضرت اقدس یوں بیان فرماتے ہیں:

''قبل ظہر انھوں نے مجھے حضرت کا یہ پیغام سنایا تھا بس سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دہکتے ہوئے تنور پر کسی نے بھری ہوئی مشک چھوڑ دی ہو، اور جلتے ہوئے سینہ پر برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو، عصر تک نصف سے بھی کم پریشانی رہ گئی اور مغرب تک تو بس بالکل مطلع صاف تھا''۔

اس طرح ''شوق'' کی کیفیت انس میں بدل گئی، اور یہ انس اس انس

سے اوقع تھا جو پہلی مرتبہ کے غلبۂ شوق کے بعد (حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری سے قبل) حاصل ہوا تھا، مشہور ہے کہ ''ہر کہ از حق انس گیرد از خلق وحشت گیرد''۔

رفتہ رفتہ مجدد الملت کو تعلقات سے وحشت شروع ہوئی۔

اور دن بدن ایسی ترقی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ کانپور جیسے محبوب مقام اپنے قائم کردہ مدرسہ اور درس و تدریس سے بھی برداشتہ خاطر ہو گئے، حضرت شیخ کی نصیحت یاد آئی کہ ''اگر کبھی کانپور سے دل برداشتہ ہو جاؤ تو پھر توکل بخدا تھانہ بھون ہی جا کر بیٹھ جانا''۔

۱۳۱۴ھ کے ختم پر اب ٹھان لی کہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کو جو ''دکان معرفت'' کہلاتی تھی دوبارہ مسکن بنایا جائے، لیکن کانپور کے فریفتہ و گرویدہ لوگوں سے بے مروتی تو نہ برتی جا سکتی تھی، اپنی خداداد فراست سے کام لیا، اتفاقاً ان دنوں مدرسہ کی حالت کچھ خراب ہو چلی تھی، اس بہانے سے پہلے تنخواہ سے دست برداری حاصل کی، پھر اپنی جگہ مولوی اسحاق صاحب بردوانی کو مدرس اول بنایا اور خود برائے نام سرپرستی قبول فرمالی، اس طرح پورے حسن تدبیر سے مدرسہ کو ہر طرح کے نقصان و حرج سے بچاتے ہوئے اور اہل کانپور سے کچھ دن آرام لینے کا عذر کر کے آخر صفر ۱۳۱۵ھ میں خوش خوش کانپور سے چل نکلے۔ تھانہ بھون آ کر حضرت شیخ کو مطلع فرمایا، تو جواب آیا ''بہتر ہوا

کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے، امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیرہ کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سرنو آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے۔

(مکتوب: ۳۶، ۱۲ ربیع ۱۳۱۵ھ)

ادھر مدرسہ کانپور کے حالات وقتاً فوقتاً دریافت فرماتے رہے اور ہدایات دیتے رہے تاکہ اہل کانپور کو ترک تعلق کا گمان نہ گذرے، مگر جب دیکھا کہ مدرسہ کی مشین ٹھیک نہج پر چل رہی ہے اور اب اظہار عزم سے اس میں خلل کا اندیشہ نہ رہا تو لکھ بھیجا کہ ؎

زقیل و قال مدرسہ حالے ولم گرفت
یک چند نیز خدمتِ معشوق می کنم

اہل کانپور کو جب یہ خبر ملی تو عرض کی کہ مدرسہ کا کوئی کام حضرت کے ذمہ نہ ہوگا لیکن قیام کو کانپور ہی میں رہے، حضرت والا نے بتا دیا کہ جو کچھ کیا ہے حضرت حاجی صاحبؒ کے حکم سے ہے، ان لوگوں نے پھر حضرت حاجی صاحبؒ سے آگے قیام کی اجازت چاہی، لیکن حضرت قدس سرہ نے ان کو اور مجدد الملت کو یہ لکھ بھیجا کہ "فقیر کے نزدیک مستقل قیام آپ کا تھانہ بھون میں ضروری ہے، باقی تعطیل وغیرہ کسی فرصت میں یا جس وقت طبیعت کچھ گھبرائے تو کانپور کا دورہ کریں، اور ان لوگوں کی خبر گیری کریں اور طالب کے لیے تو تھانہ بھون کانپور سے کچھ دور نہیں"۔

۱۳۱۵ھ سے مستقل قیام تھانہ بھون

۱۳۱۵ھ سے مجدد الملت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو تا آخر حیات باقی رہا یعنی مستقل قیام تھانہ بھون۔

مجدد الملت اسی ''دوکانِ معرفت'' میں پہنچ کر جس کی رونق حضرت حاجی صاحبؒ کی ہجرت اور حضرات حافظ ضامن صاحبؒ و مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی شہادت و رحلت کے باعث ماند ہو چکی تھی، پھر باعث فروغ رونق ہونے کانپور کو ترک کیا، درس و تدریس سے چھٹی لے لی، والد ماجد کے ترکہ کو مشتبہ پا کر خیر باد کہا، اپنے شیخ عالی مرتبت کی نصیحت اور استاذ ذی معرفت (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) کی تسلی سے بالکل متوکلاً علی اللہ ہمہ تن مشغول بحق ہو گئے، پھر کیا تھا کبھی تجلی، جمال سے سکینت پاتے اور کبھی تجلی جلال سے ''برق تپاں'' بن جاتے''۔

صبغۃ اللہ کا رنگ چڑھتا رہا جو آتے گئے ان کو بھی اسی رنگ میں ڈبوتے گئے، خانقاہ کی رونق میں چار چاند لگ گئے، اس دور میں رنگ ہی اور تھا، خود سراپا سوز و گداز تھے، اس لیے جو بھی آ جاتا سوختہ، گداختہ بن جاتا .... سلوک کی منزلیں طے ہوتی رہیں، حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اپنے اس بندہ کو اعلیٰ ترین مقام پر فائز کرے اور اس راہ کی دشواریوں سے واقف کرائے تا کہ اس کے بندوں کی رہبری میں سہولت ہو اور ان کو لے چلنے میں حیرانی نہ رہے۔

ایک مرتبہ پچھلی رات کو تہجد کے لیے وضو کرتے ہوئے یک بیک بلا اختیار ایک خطرۂ منکرہ کا ورود ہوا جس کا حاصل چند الفاظ تھے جو دفعۃً متخیلہ میں واقع ہو گئے گو یہ کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن اس مرتبہ اس درجہ شدید و مدید اثر ہوا کہ حضرت والا اپنی زندگی ہی سے بیزار ہو گئے، یہاں تک کہ خودکشی تک کے وسوسے آنے لگے، چنانچہ خود فرماتے تھے ایک بار ایک صاحب ملنے آئے ان کے پاس اس وقت بھری ہوئی بندوق تھی، بار بار میرے جی میں آتا تھا کہ ان سے کہہ دوں کہ خدا کے لیے فیر کر کے میرے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کر دو، کیونکہ میں فرعون وہامان سے بھی بدتر ہوں، وہ جس بلا میں مبتلا ہیں اس سے ایمان لا کر ایک منٹ میں چھٹکارا ہو سکتا ہے اور میں جس بلا میں مبتلا ہوں اس سے سالہا سال میں بھی خلاصی ممکن نہیں۔

حالت تو یہ تھی اور ساتھ ہی ساتھ دونی مشکل یہ کہ خود بقول حضرت اقدسؒ اگر ذکر کرنے بیٹھتا (جو کہ قرب کی حالت تھی تو ساتھ کے ساتھ وہ خطرۂ منکرہ بھی عود کر آتا اور اگر عود خطرہ سے بچنے کی غرض سے ذکر کو منقطع کرنا چاہتا (جو کہ بعد تھا) تو اس کو بھی کسی طرح دل گوارا نہ کرتا تھا) گویا یہ حالت تھی۔

من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
نزدیک آں چنانم دور آنچناں کہ گفتم
نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

غرض سخت کشمکش میں مبتلا تھا اور ایسی شدید حالت تھی کہ باوجود صحت بدنی کے موت کو حیات پر ہزار درجہ ترجیح دیتا تھا، حسن اتفاق سے یہ خطرہ تہجد کے وقت قیام گنگوہ میں واقع ہوا تھا فوراً قطب ارشاد حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں پہنچ کر حالت عرض کی، ارشاد ہوا۔

''التفات نہ کیا جائے'' مجدد الملت تھانہ بھون تشریف لے آئے لیکن وہ خطرہ منکرہ برابر زور ہی پکڑتا گیا جس سے انفعالی کیفیت بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ اختلاج قلب کے ایسے شدید دورے پڑنے لگے کہ بندی دنوں میں نہایت نحیف وکمزور کر دیا۔ حکیم مولوی محمد صدیق صاحب گنگوہی اتفاقاً تھانہ بھون آئے ہوئے تھے، ان سے بغرض معالجہ رجوع کیا حکیم صاحب نے قارورہ دیکھ کر کہا ''مجھے حیرت یہ ہے کہ یہ شخص زندہ کیوں کر ہے قارورہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ حرارت عزیزیہ بالکل ختم ہو چکی ہے'' بہتیرا علاج کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا، اور فائدہ ہوتا کس طرح ''درد'' ہی وہ تھا جس کا علاج بجز خزانہ ''غیب'' کے اور کہیں نہ تھا حکیم الامتؒ نے خانقاہ چھوڑ کر سفر اختیار کیا کبھی کبھی خالی بندوق لے کر فیر کرتے، اور اسی سے فرحت پاتے، اس دوران میں حضرت گنگوہی سے برابر ملتے رہے اور اپنی حالت پیش فرماتے رہے حضرت گنگوہی تو امام فن'' اور قطب ارشاد'' تھے، دعا وتوجہ صرف فرمائی نہیں جواب ہمیشہ وہی دیتے رہے کہ خطرات کی طرف التفات نہ کرو، ساتھ ہی ساتھ حکیم

الامت نے اپنے شیخ باکمال کو بھی ان احوال سے آگاہ فرمایا جواب آیا ''الحمدللہ! آپ کے قلب کی حالت بہت اچھی ہے یہ مقام خوف ورجا ہے'' اسی کو ہیبت وانس کہتے ہیں۔

کبھی ''ہیبت'' کبھی ''انس'' کا غلبہ ہوجاتا ہے دونوں کو ایک سمجھنا چاہئے فقیر دعا کرتا ہے جو کچھ قلب پر وارد ہو منجانب اللہ خیال کرو، جو واردات مضر ہوں گے، اس مراقبہ سے سب دفع ہوجائیں گے۔

اس قسم کی گھاٹیاں طالب کو آیا کرتی ہیں، ان شاء اللہ سب سے پار ہوجاؤ گے۔ (مکتوبات: ۴۴ تا ۴۶، رجب وشعبان ۱۳۱۶ھ)

پھر مکتوب: ۴۹، ۱۵ ارمحرم ۱۳۱۷ھ میں تحریر فرماتے ہیں آپ کی حالت اب بحمد اللہ بہت اچھی ہے، فقیر دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ ترقی فرمائے، غرض تقریباً ایک سال تک یہ غلبہ ہیبت طاری رہا اور حضرت شیخ کی حیات ہی میں یہ دشوار گذار گھاٹی طے ہوگئی اس ایک سالہ دور میں حضرت مجدد الملت کو جو حالت شدید پیش آئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مرید نے اپنی باطنی پریشانیوں کی تفصیل لکھ بھیجی تو جواباً فرماتے ہیں ''جو جو مضائق و مصائب وعقبات وبلیات آپ نے لکھی ہیں یہ تو سوحصوں میں سے ایک حصہ بھی نہیں جو بعض کو پیش آتے ہیں، اس وقت مجھ کو بعض (مراد خود حضرت مجدد الملت کے احوال یاد آگئے اور سر سے پاؤں تک اس نے مجھے ہلا دیا۔

۱۸؍محرم ۱۳۳۲ھ کو یعنی غلبۂ ہیبت کے فرو ہونے کے پندرہ برس بعد بھی محض اس وقت کے تصور نے سر سے پاؤں تک ہلا دیا، اب اندازہ لگاؤ خود اس وقت کیا گذری ہوگی .... اہل فن جانتے ہیں کہ اس ''قبض'' شدید کے بعد کس قدر اعلیٰ درجہ کا ''کیسا'' اور اس ''ہیبت'' تو یہ کے بعد کتنا لازوال اور ترقی پذیر انس حاصل ہوگا اور کیا ''رسوخ''، تمکن میسر آیا ہوگا کیونکہ یہ عادت جاریہ ہے۔

الحاصل حضرت مجدد الملت کو دو مرتبہ عطا ہوا جس کو ''عبدیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی لازمی صفت بندگی اور سرافگندگی ہے ذیل میں ایک ملفوظ درجہ ہے، اس سے حضرت اقدسؒ کے مقام عبدیت کا اندازہ ہوسکتا ہے،

''بہ قسم کہتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو کسی مسلمان سے حتیٰ کہ ان مسلمانوں سے بھی جن کو لوگ فساق فجار سمجھتے ہیں فی الحال، اور کفار سے بھی احتمالاً فی المآل افضل نہیں سمجھتا اور آخرت میں درجات حاصل ہونے کا کبھی مجھے وسوسہ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ درجات تو بڑے لوگوں کو حاصل ہوں گے مجھے تو جنتیوں کی جوتیوں میں بھی جگہ مل جائے تو اللہ کی بڑی رحمت ہو اس سے زیادہ کی ہوس ہی نہیں ہوئی۔ اور اتنی ہوس بھی بر بنائے استحقاق نہیں بلکہ اس لیے کہ دوزخ کے عذاب کا تحمل نہیں اور یہ جو میں بضرورت اصلاح زجر و توبیخ کیا کرتا ہوں تو اس وقت یہ مثال پیش نظر رہتی ہے کہ جیسے کسی شہزادے نے جرم کیا ہو اور بھنگی

جلاد کو حکم اساسی ہوا ہو کہ اس سہزادے کو درّے لگائے تو کیا اس بھنگی جلاد کے دل میں ڈرے مارتے وقت کہیں یہ بھی وسوسہ ہو سکتا ہے کہ میں اس شہزادے سے افضل ہوں۔ غرض کوئی کیسا ہی بداعمال ہو، میں اس کو حقیر نہیں سمجھتا بلکہ فوراً یہ مثال پیش نظر ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حسین اپنے منھ پر کالک مل لے تو اس کو جاننے والا کالک کو برا سمجھے گا، لیکن اس حسین کو حسین سمجھے گا، اور دل میں کہے گا جب کبھی بھی صابن سے منھ دھولے گا پھر اس کا وہی چاند سا منھ نکل آئے گا۔ غرض مجھ کو صرف فعل سے نفرت ہوتی ہے فاعل سے نہیں۔

مجدد الملّت مسند ارشاد پر

یوں توج ثانی کے بعد کانپور ہی سے رشد و اصلاح باطنی کا کام شروع ہو چکا تھا اور حضرت گنگوہی قدس سرہ بھی اپنے بعض بعض مریدین کو حضرت کی خدمت میں بھیجنے لگے تھے اور پھر تھانہ بھون پہنچ کر ذاکرین اور مریدین کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی لیکن گذشتہ ''مرحلہ ہیبت'' کے تقریباً سال بھر میں اصلاح خلق کا سلسلہ رک گیا تھا اور خود آپ ہی نے اس کو یہ کہہ کر ملتوی فرما دیا تھا کہ اس حالت میں کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، لیکن جب اس شدید اور آخری مرحلہ سے بھی حق تعالیٰ نے گذار دیا تو اب مسند ارشاد پر پھر جلوہ فرما ہوئے، اور تربیت کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ مولانا محمد حسن کاکوری" مشہور نعت گو کے فرزند مولانا انوار الحسن صاحب کاکوری کا ایک خواب درج ذیل

ہے جس سے حضرت حکیم الامتؒ کے منجانب اللہ اس مقام پر فائز ہونے اور اپنے وقت کے ''مجدد'' ہونے کی بشارت ملتی ہے خود تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے سفر حج میں بمقام مدینہ طیبہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کے متعلق ایک خواب دیکھا حالانکہ اس زمانہ میں مجھ کو حضرت مولانا سے کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی، البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا اور میرا خاندان بھی علمائے اہل حق کا کچھ زیادہ معتقد نہ تھا، غرض حضرت مولانا کا مجھ کو مدینہ طیبہ میں کوئی بعید سے بعید بھی خیال نہ تھا کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چارپائی پر بیمار پڑے ہوئے ہیں، اور حضرت مولانا تھانوی تیمارداری فرمارہے ہیں، اور ایک بزرگ دور بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے جن کے متعلق خواب ہی میں معلوم ہوا کہ یہ طبیب ہیں، آنکھ کھلنے پر فوراً میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضور تو کیا بیمار ہیں، حضور کی امت بیمار ہے، اور حضرت مولانا اس کی تیمارداری یعنی اصلاح فرمارہے ہیں، لیکن وہ بزرگ طبیب جو دور بیٹھے نظر آئے تھے وہ سمجھ میں نہ آئے کہ کون تھے، واپسی ہندوستان پر میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں یہ خواب لکھ کر بھیجا اور جتنی تعبیر میری سمجھ میں آئی تھی وہ بھی لکھ دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ بزرگ طبیب کون تھے جو دور بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے، حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ہیں، اور وہ چونکہ ابھی زمانا بعید ہیں اس لیے خواب میں ما کانا بعید دکھائی دیئے''۔

چنانچہ حضرت اقدس نے تھانہ بھون کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر دولت و ثروت اور دنیویات کو ٹھکرا کر وہ بادشاہت کی جو کم کسی کے حصہ میں آتی ہے، ہندوستان کے شمال وجنوب اور مشرق ومغرب سے لوگ پروانہ دار آئے اور اس شمع ضیاپاش سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق روشنی کے سامان حاصل کر گئے، وہ بھی آئے جن کی پیاس چشموں سے نہ بجھتی تھی اور یہاں آ کر چھک گئے، لوگوں اور مریدوں کی آمد ورفت کا یہ عالم تھا کہ قصبہ تھانہ بھون کے لیے ایک مستقل ریلوے اسٹیشن بنا دیا گیا اور خانقاہ امدادیہ کی ''دکان معرفت'' پر خریداران علم وعرفان کا وہ ہجوم ہوا جو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) رحمۃ اللہ علیہ کے بعد تاریخ ہند میں شاید اپنی نظیر آپ تھا، مریدین ومعتقدین سینکڑوں نہیں ہزاروں تھے صرف ''مجازین'' ہی کی تعداد (۱۲۹) ہے جس میں (۷۰) مجازین بیعت یعنی خلفاء ہیں، اور (۵۹) مجازین صحبت ہیں جن کو بیعت کی تو اجازت نہیں لیکن تبلیغ کی اجازت حاصل ہے، پھر مذکورہ (۷۰) خلفاء ہیں نہ صرف وہ ہیں جو کتابی علم دین میں کم دسترس رکھتے ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو اپنے وقت کے علامہ اور اپنے دور کے اساتذہ کامل ہیں جیسے مرشدی حضرت مفتی اعظم پاکستان، مولانا محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم، حضرت مولانا علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری مدظلہ مہتمم مدرسہ جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند،

حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ مہتمم خیر المدارس ملتان، حضرت مولانا اظہر علی صاحب سلہٹی مدظلہ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاملپوری صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی قدس اللہ سرہ سابق پروفیسر فلسفۂ اسلام جامعہ عثمانیہ، حضرت اقدس کو یہ شرف ملا تھا کہ جس طرح حضرت مجدد الف ثانی کے دور میں علماء و اتقیاء آپ کے خوانِ فیض کے زلہ بردار تھے اسی طرح اس دور کے سارے علماء اسی ''دکان معرفت'' کے خریدار تھے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ضبط اوقات و تنظیم کار

حالات کے کچھ ایسا پلٹا کھایا ہے کہ دینداری اور لاابالی پن مترادف دکھائی دینے لگے ہیں، اور عوام تو عوام اچھے اچھے پڑھے لکھے بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دیندار کے پاس نہ کسی ضابطہ کی حاجت ہے نہ قواعد کی حالانکہ ایک سچے مومن ہی کی زندگی نظم و ضبط کا بہترین نمونہ ہوسکتی ہے۔ حکیم الامت کی مجددانہ شان کا یہ وصف بھی بہت ممتاز ہے آپ نے خارجی زندگی اور داخلی زندگی کا ایسا اصولی نمونہ پیش کیا کہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اہل حق ایسے بھی ہوتے ہیں اور اہل فہم نے سمجھ لیا کہ مصلحانِ دین ایسے ہی ہوتے ہیں، بعض کم عقلوں نے اعتراض کیا کہ یہ تو بالکل انگریزیت ہے کہ ملنے کے اوقات مقرر گفتگو کے طور طریقے

متعین، لیکن ان کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے ع

بریں عقل ودانش بباید کریست

کیونکہ بغیر اس اصولی زندگی کے نہ خود کو راحت میسر آ سکتی ہے نہ غیر کو، نہ اپنی صلاحیتوں سے استفادہ وافادہ ممکن ہے نہ غیر کی تربیت واصلاح، نہ اپنی صحت وتوانائی برقرار رہ سکتی ہے نہ اس کی افادیت اس لیے خانقاہ امدادیہ مین ان زریں اصول کو جس کا ماخذ۔ بہر حال اسوہ وارشادات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے یا نہیں کیا جاتا تھا۔

خارجی زندگی

حضرت کے اوقات اس طرح بٹے ہوئے تھے، صبح سے ۱۲ بجے تک اور نماز عصر سے عشاء تک کے اوقات اپنے انفرادی امور مثلاً تصنیف وتالیف وغیرہ کے لیے مختص تھے البتہ اس میں یہ استثناء تھی کہ نو وارد جو پہلی ملاقات کرنا چاہے مقیم جو رخصتی ملاقات کا طالب ہو، وہ جس کو کوئی فوری ضرورت لاحق ہو، ۱۲ بجے سے نماز ظہر وقیلولہ تک بالکل تنہائی کا وقت تھا اور اس میں کوئی استثناء نہ تھا، نماز ظہر وقیلولہ سے فراغت کے بعد نماز عصر تک عام مجلس ہوتی تھی جس میں ہر شخص شریک ہو سکتا تھا اور بات چیت کر سکتا تھا، پھر بعد نماز عشاء کسی سے نہ ملتے تھے لیکن یہ تو ان کے لیے ہوا جو برملا اپنے مدعا ظاہر کر سکتے تھے، راز اور تنہائی کے طالبوں کے لیے اصول یہ تھا کہ سہ دری میں آویزاں لیٹر بوکس کے

اندر یا تو اپنا مدعا لکھ کر ڈال دیں یا اس کے عرض کرنے کے لیے تعین وقت چاہیں، اور ہر دو صورتوں میں اپنا پتہ ضرور لکھ دیں (یعنی خانقاہ کے کس کمرہ میں مقیم ہیں) تا کہ جواب بآسانی وہاں پہنچ جائے، نہ سائل کو تکلیف ہو نہ مسئول کو۔ خانقاہ امدادیہ کا یہ بھی اصول تھا کہ کوئی شخص بلا اجازت صاحب خانقاہ کی خدمت نہ کرے نہ کوئی ان کے ہمراہ چلے اور نہ راستہ میں کوئی ان سے مصافحہ کرے، خود اپنے کام میں مشغول رہے اور حضرت شیخ کو اپنے امور مشاغل میں آزاد رکھے۔

چونکہ پڑھے لکھے اور غیر تعلیم یافتہ آداب سے واقف اور بے ادب سب ہی طرح کے لوگ آتے تھے اور ہر ایک کو بار بار تنبیہ میں کافی وقت ضائع ہونے کا امکان تھا، اس لیے صحیح تعارف حاصل کرنے کے لیے حضرت نے ایک جدول بنا رکھا تھا تا کہ اس کے مطابق خانہ پری کر کے حضرت کو دے دیں اس کے عنوانات یہ تھے۔

(۱) نام (۲) وطن اصلی، (۳) اس وقت کس مقام سے آنا ہوا، اور وہاں کی مدت قیام (۴) شغل و ذریعۂ معاش (۵) کوئی موروثی زمین کے مالک تو نہیں، (۶) علمی استعداد اردو عربی، یا انگریزی کسی قدر ہے، (۷) آنے کا مقصد اصلی کیا ہے، محض ملاقات یا کچھ بھی، لکھ کر دینا یا زبانی مجمع میں یا تنہائی میں، (۸) کسی سے بیعت ہیں یا نہیں اگر ہیں تو کس سے؟ (۹) اگر مجھ سے بیعت ہیں تو اس کو کتنا عرصہ ہوا، اور تعلیم کس سے متعلق ہے،

(۱۰) میرے مواعظ ورسائل کیا کیا دیکھے ہیں، اگر مجھ سے کچھ خط وکتابت ہوئی ہے تو وہ پاس ہے یا نہیں، اگر ہے تو دکھلائیں (۱۱) کتنا قیام ہوگا کہاں قیام ہوگا، خانقاہ میں پہلی مرتبہ آنا ہوا ہے یا پہلے بھی آئے ہیں، یہاں کے انتظام طعام کی خبر ہے یا نہیں، باہر والا بڑا اعلان قلمی دیکھ لیا یا نہیں؟

یہ وہی اعلان ہے جس میں حضرت کے اوقاتِ فراغت ومصروفیت کی تفصیل ہے۔

اس کے علاوہ ہر ہر طبقہ کے افراد کے لیے اصول وضوابط متعین تھے اور سب میں یہی روح کارفرما تھی کہ مرشد ومرید دونوں کو راحت حاصل رہے، تضیع اوقات نہ ہو، اور بے جا اختلاط نہ رہے، اب کوئی بتائے بغیر اس نظم و ضبط کے مجدد الملتؒ وہ کچھ کر سکتے تھے جو انھوں نے کر دکھایا، سینکڑوں کتابوں اور رسالوں یں حقائق ومتعارف کے ذخائر جمع فرمائے، ہزاروں خطوط کے گراں بہا جوابات لکھے، سینکڑوں مواعظ کے ذریعہ رشد وہدایت کے دریا بہائے ان گنت ملفوظات کے ذریعہ طریقت کے عقدے کھولے، ہزاروں تشنگانِ حب الٰہی کو سیراب کر گئے، یہ سب اسی اصولی زندگی کا نتیجہ تھا۔

داخلی زندگی

وعظ و پند، اصول وضوابط صرف اغیار کے لیے نہ تھے گھر کی نجی زندگی میں بھی ان پر نگاہ رکھی جاتی تھی اور اپنے عمل سے اس کی افادیت

منوائی جاتی تھی، البتہ ہر موقع و مقام کے لحاظ سے اصول بھی جدا تھے اور ہونے بھی چاہئیں۔

حضرت کی دو ازواج مطہرات تھیں اس لیے جو بھی نقد یا جنس کی شکل میں آتا مساوی مساوی کر کے اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے، غیرت کا یہ عالم تھا کہ دونوں کے مہر ادا کر دیئے تھے اور باوجود فریق ثانی کی طرف سے معافی کے واپس لینا گوارا نہ فرمایا، حضرت سخت گیر نہ تھے کبھی گھر والوں سے تکلف و تحکم کا برتاؤ نہ کرتے بلکہ ہمیشہ لطف و کرم سے پیش آتے اور بہت ہشاش بشاش رہتے تھے، اپنی ازواج کے مہمانوں کی پوری مدارات کرتے اور ان کے بچوں سے خوب مزاح فرماتے تھے۔

اہل خانہ پر حتی الامکان کوئی بوجھ نہ ڈالتے تھے حتی کہ کسی خاص کھانے کی فرمائش نہ کرتے، البتہ جب خود ادھر سے فرمائش کرنے کا اصرار ہوتا تو اس میں بھی ایسا اسلوب اختیار کرتے کہ ان کی دل شکنی ہو نہ ان پر بار پڑے، فرماتے ''تم ہی خود چند کھانوں کے نام لو جو بآسانی پک سکیں، ان میں سے مجھے جو مرغوب ہوگا بتلا دوں گا۔

باوجود کثرت مشاغل کے گھر پابندی سے تشریف لے جاتے تھے تا کہ ان کی دل آزاری نہ ہو، ان کی بیماریوں پر پوری فراخ دلی سے روپیہ صرف فرماتے اور ضرورت ہوتی تو دور دراز مقامات کو لے جا کر علاج کرا دیتے تھے، اس طرح تعلق مع اللہ کے بہانے حقوق تلفی کبھی نہ ہونے دیتے تھے، یہ تو ان

دوکانداروں کا شعار ہے جو سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نا آشنا ہوتے ہیں جن کے نزدیک عبادت وتعلق مع اللہ کا رشتہ اتنا نازک ہے کہ مسجد و خانقاہ کے باہر قدم رکھتے ہی تار تار ہو جاتا ہے حالانکہ اتباع سنت کے تحت ہر فعل جو مسجد و خانقاہ میں ہو یا گھر اور بازار میں ہو عین عبادت اور ترقی قرب کا موجب ہے، اور یہی صفت ''بے ہمہ باہمہ'' کمال کی دلیل ہے۔

حضرتؒ نے تو دو عقد کر کے عدل و انصاف کی وہ نظیر قائم کی کہ اب لوگوں کے لیے عقد ثانی کی جرأت مشکل ہوگئی، خود فرماتے تھے میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتا ہوں، کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہوگی جس کی باری ہے اور یہ اس کا حق تلفی ہے، اب میں اپنے کپڑے خانقاہ ہی میں رکھتا ہوں کیونکہ اگر میں ایک گھر میں کپڑے رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت ہوتی کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔

مجدد الملت کے اس اشعار کو غور سے دیکھو اور جان لو کہ دینداری میں معاشرت، معاملات و اخلاق اتنے ہی مہتم بالشان ہیں جتنے عقائد و عبادات، تکمیل دین کے لیے ان پانچوں پہلوؤں پر یکساں نظر ضروری ہے، حکیم الامت کو سخت رنج ہوتا جب شوہروں کے ظلم و ستم کی روایتیں آپ تک پہنچتیں، آپ ہر ایک کو اپنی بیویوں پر مہر و کرم، عفو و درگذر اور پاس مروت کی تلقین فرماتے تھے۔

علالت ورحلت

رشد وہدایت کا وہ آفتاب جو ۱۲۸۰ھ میں مطلع تھانہ بھون سے نمودار ہوا، اور ۱۳۳۵ھ سے ہندوستان کے طول وعرض میں شریعت وطریقت کے انوار پھیلاتا رہا، بالآخر ۱۳۶۲ھ میں ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

تاریخ وفات سے شاید پانچ برس پہلے ہی سے معدہ وجگر کی تکلیفوں نے عاجز کررکھا تھا، کبھی قبض ہوتا تو ہٹنے کا نام نہ لیتا، اور کبھی اسہال ہونے لگتے تو رکنے ہی نہ پاتے تھے، مختلف اعضاء متورم ہوچکے تھے، علاج برابر ہوتا رہا، اور حق تعالیٰ کی اس امانت کی حفاظت میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی، لیکن تدبیر ہی تو بندہ کے اختیار میں ہے ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

بالآخر بھوک بھی تقریباً بند ہوگئی، نحیف و ناتواں اور صاحب فراش ہوگئے، اکثر غنودگی کی کیفیت طاری رہنے لگی، مگر جب بھی ہوش آتا اور جتنی بھی دیر رہتا اپنے عارفانہ کلمات خطوط کے جوابات اسی حکیمانہ انداز سے ادا فرماتے تھے، انہی باتوں کو دیکھ کر عقدہ کھلا کہ یہ غنودگی کے دورے نہ تھے بلکہ ''ربودگی'' کی کیفیات تھیں، ورنہ کسی کی عقل مان سکتی ہے کہ اس درجہ کے ضعف میں بار بار کے دوروں کے باوجود عقل وفکر کسی درجہ میں بھی متاثر نہ ہوں؟ مثلاً دیکھو کہ عین اسی چل چلاؤ کی حالت میں ۳۰۰ روپے کا ایک منی

آرڈر آیا اس میں لکھا تھا کہ ''میں نے ایک منت مانی تھی کہ اگر کاربار میں کامیابی ہوگی تو (۳۰۰) روپے حضرت والا کی خدمت میں بھیجوں گا، چنانچہ خستہ مرسل خدمت ہیں، آپ مالک ہیں جہاں چاہیں صرف فرمائیں۔ اس کا جواب اپنی ناتواں انگلیوں سے بدقت تمام یہ فرمایا ''پہلے تو تم نے لکھا ہے آپ مالک ہیں، بعد کو اختیار خرچ کرنے کا دیا ہے اور یہ صیغہ توکیل کا ہے، چونکہ مالک بنانے اور وکیل بنانے میں شرعاً فرق ہے لہٰذا واپس کیا جاتا ہے۔

حفظ شریعت کا ایسا خیال اور اس کا اتنا اہتمام کسی غائب دماغ سے ممکن بھی ہے اور یہ تو ایک مثال ہے ورنہ وہاں تو شب و روز یہی کرامت جاری تھی، مرض الموت کے دن گذرتے گئے، دوشنبہ ۱۵/رجب ۱۳۶۲ھ کو صبح ہی سے مسلسل دست آنے لگے، کمزوری و نقاہت نے رفع حاجت کے قابل کب رکھا تھا، مجبوراً بار بار کپڑے بدلے جاتے رہے، خود صاحب مرض کو صفائی و طہارت نماز اور ادائیگی حقوق کا تا دم آخر اہتمام رہا۔ اسی دوشنبہ کو بعد نماز مغرب اپنی چھوٹی رفیقۂ حیات سے پوچھا ''میں دونوں کا ماہوار خرچ دے چکا ہوں؟ تسلی دلائی گی''، ''ہمیں بہت کچھ مل چکا ہے آپ دے چکے ہیں بے فکر رہیں'' پھر فرمایا آج تو ہم جارہے ہیں رفیقہ نے عرض کی کہاں؟ فرمایا تم نہیں جانتیں، اس کے بعد پھر جو غشی طاری ہوئی تو سوا گھنٹہ تک ہوش نہ آیا، سانس تیزی اور آواز سے چلتا رہا، جب سانس اوپر آتا تو کتنی دیکھنے والیوں نے دیکھا کہ آپ کی درمیانی اور شہادت کی انگلی کے بیچ ہتھیلی کی پشت سے ایک

ایسی تیز روشنی نکلتی تھی کہ جلتے ہوئے برقی قمقمے ماند پڑ جاتے تھے، یہ روشنی سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ آتی جاتی رہی، اور جب وہ ختم ہوا تو یہ بھی غائب ہوگئی، کیا عجب وہ ختم ہوا وہ یہ بھی غائب ہو، کیا عجب کہ جن انگلیوں سے حقائق و معارف ایک عرصہ تک معرض تحریر میں آتے رہے یہ نور اسی کا ہو۔

بہرکیف محفل دوشیں کا وہ چراغ جو کئی برس سے مرض کے تندو تیز جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل سنبھل جاتا تھا بالآخر سہ شنبہ کی (یعنی ۱۷ ر رجب ۱۳۶۲ھ/ ۱۹ و ۲۰ ر جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی رات) ۸۲ سال ۲ ماہ ۱۱ دن کی عمر پاکر ہمیشہ کے لیے بجھ گیا، فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس سانحۂ عظیم کی اطلاع ہوا کی طرح پھیلی، اور برق بن کر عشاق کے قلوب پر گری، صبح ہوتے ہوئے ہزاروں محبت کے مارے جو پہلے ؎

در ہوائے کوئے جاناں میروم
سرخوش و شاداں و فرحاں میروم
او حکیم الامت و من جاں بلب
در حضورش بہر درماں میروم

کی نعمتوں سے مست و سرشار چلے آتے تھے، آج فریادی اشکوں کے ساتھ آئے کہ ؎

سر وسمیتا بصحرا ہوا میروی — سخت بمہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہِ عالم روئے تو — تو کجا بہر تماشا میروی

دہلی اور دوسرے شہروں سے اسپیشل ٹرینیں آئیں، اور ہزاروں شیدائیوں کے ساتھ مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کا جنازہ نکلا ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

عیدگاہ میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور پھر آپ ہی کے وقف کردہ تکیہ میں جس کا تاریخی نام ''قبرستان عشق بازان'' تھا جسم مبارک کو پیوند خاک کیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ۔

سنا ہے کہ جو شریک جنازہ تھے ان کو پھر بھی چین وسکون آیا لیکن جن کی قسمت میں ''اویسی'' ہی تھیں ان کی آتش فراق ایک عرصہ میں جا کر فرو ہوئی، اس کا اندازہ نہ ہی کر سکے جس نے کبھی عشق حقیقی کی چوٹ کھائی ہو، زبان قلم اس حسی کیفیت کے اظہار سے عاجز ہے ع

اے آتشِ فرقت جا کباب کردہ

شہادات انام

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

گو بفضلہٖ تعالیٰ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات علمیہ وعملیہ وحالیہ آفتاب نصف النہار کی طرح روشن اور ایسے مشہور زمانہ ہیں کہ ان کے لیے اب کسی شہادت کی حاجت نہیں، بالخصوص شہادت انام کی بمجہ اے ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب

لیکن صحیح بخاری و مسلم کی حدیث "انتم شهداء الله فی الارض" جو ایسے ہی موقع پر ارشاد فرمائی گئی تھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اگر کسی کے مرنے کے بعد عام طور سے لوگ اس کی تعریفیں کریں تو اس کی توقع ہے کہ وہ عند اللہ بھی اچھا تھا، کیوں کہ حسب ارشاد نبوی "انتم شهداء الله فی الارض" عامۃ الناس بھی زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ ہوتے ہیں، یہی مضمون ایک روایت میں یوں آیا ہے فی آخر حدیث "انسؓ ان للہ ملائکته تنطق علی السة بنی آدم بما فی الرء من الخیر الشر"۔ بخاری و مسلم۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے بعض فرشتے متعین فرمار کھے ہیں کہ وہ انسان کا خیر وشر لوگ ،ں کی زبانوں پر جاری کردیں، نیز اپنے محبوب کی ہر کس وناکس سے تعریفین سن کر محبین کو خوشی بھی ہوتی ہے، جس کی اس کو ان غم میں ضرورت بھی ہے، اس لیے سینکڑوں واقعات اور تحریرات میں سے جو سننے میں آئیں صرف چند ہی بطور نمونہ پیش ہیں۔

ملک کی جتنی مسلم جماعتیں ہیں جن میں وہ شامل ہیں جن کو حضرت اقدس سے کچھ سیاسی یا مشربی اختلاف بھی تھا، قریب قریب سب نے بالاتفاق اس خسارہ کو خسارہ عظمیٰ محسوس کیا، جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے، تقریریں ہوئیں، اور تقریروں کے وقت بعض مقررین وسامعین کی ہچکیاں بندھ گئیں، ریزولیشن پاس ہوئے، فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی ہوئی، بعض بعض جگہ مدارس

بند ہوئے، بلکہ دکانیں بند ہوئی، اور بعض جگہ اس ڈر سے کہ کہیں ناجائز نہ ہو، اس ارادہ پر عمل کی ہمت نہ ہوئی، حالانکہ وہ آزاد لوگ تھے، لیکن حضرت اقدس کی دینی شخصیت کا اتنا اثر سب پر تھا کہ خود بھی حضرت کے معاملہ میں احتیاط کے خلاف کرنے کی جرأت نہ ہوئی، اکثر جگہ بہت بہت ایصال ثواب کیا گیا، پانی پت سے اطلاع ملی کہ ۳۲ یا ۳۴ قرآن شریف ختم کیے گئے، وہاں حفاظ کی بہت کثرت ہے، متعدد جگہ تقسیم طعام کے ذریعہ بھی ایصال ثواب کیا گیا، غرض اپنے اپنے خیال اور اپنے مشرب کے مطابق سب ہی نے اظہار غم اور ایصال ثواب کیا، تمام ملکی جرائد میں جن میں غیر مسلم بھی تھے اس خبر کو خاص اہمیت کے ساتھ شائع کیا، بلکہ جہاں تک سننے میں آیا سب سے پہلے ایک غیر مسلم اخبار ہی نے اس خبر کو بہت اچھے عنوان کے ساتھ شائع کیا۔

حضرت اقدس کی علالت ہی کے زمانہ میں جس نے سنا دل سے دعا دی، اور تمنا ظاہر کی کہ اجی وہ تو بڑے شخص ہیں، خدا کرے جلد اچھے ہو جائیں، یہاں تک کہ غیر مسلموں کے بھی یہ الفاظ ہوتے تھے، ایک بہت بوڑھے شخص نے جو مسلمان تھا اور جس نے کبھی حضرت اقدس کی زیارت بھی نہیں کی تھی، جب خبر وفات سنی تو بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور کہنے لگا کہ اجی ان کی کیا بات تھی اگر کسی مسئلہ کی ضرورت ہوتی تو پہلے ڈھونڈتے پھرتے تھے اور کوئی مسئلہ بتانے والا نہ ملتا تھا اور اب ہمارے گھر کی لونڈیاں بھی بہشتی زیور دیکھ کر بتا دیتی ہیں۔

بعض جرائد نے یہاں تک لکھا کہ اگر مولانا اپنی تصانیف کی رجسٹری کرا لیتے اور خود اشاعت کرتے تو آج کم از کم چالیس پچاس لاکھ روپیہ چھوڑ کر جاتے بعض نے اپنے الفاظ میں لکھا کہ بے نظیر ہستی تھی، اور صدیوں ایسی ہستی دنیا نہیں پیدا کر سکتی بعض نے لکھا کہ متعدد کتابیں تو ایسی تصنیف کی ہیں کہ جن کی نظیر سلف میں بھی نہیں پائی جاتی، بعض نے لکھا کہ مولانا نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، ان کی اولاد ان کی تصانیف کثیرہ ہیں، چنانچہ رسالہ ''برہان'' دہلی ماہ اگست ۴۳ء میں اس حادثہ کا اظہار مضمون ذیل میں کیا گیا:

آہ حکیم الامت

انک میتٌ وانھم میتون ۔ یوں تو موت اس عالم آب و گل کی ہر اس چیز کے لیے ہی مقدر ہے جو زندگی کا عاریتی لباس پہن کر بساط ہستی پر نمودار ہوئی ہے لیکن جس طرح زندگی زندگی میں فرق ہوتا ہے اسی طرح ہر ایک کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی کبھی کبھی ایسی اموات بھی واقع ہوتی ہیں جو صرف افراد و اشخاص کی اموات نہیں ہوتیں بلکہ ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی عمارتِ حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے، جو مرنے والے کے دامانِ عقیدت و ارادت سے وابستہ ہوتے ہیں، پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چہار قطرہ ہائے اشک سے نہیں ہوتا، بلکہ ہزاروں دلوں کی پُر سکون آبادیاں ایک مستقل غمکدہ آمال و امانی بن کر رہ جاتی ہے، امیدوں اور دلوں کے چراغ

بجھ جاتے ہیں، نشاط و کامرانی حیات کے آتشکدے سرد ہو جاتے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثۂ جانکاہ نے کائنات عالم کی ہر ہر چیز کو اداس اور غمگین بنا دیا ہے، اسی قسم کی ایک موت پر عربی شاعر نے کہا تھا ؎

وما کان قیس هلکه هلک واحد ولکنه بنیان قوم تهدما

قیس کا مرنا صرف ایک شخص کا مرنا نہیں بلکہ وہ ایک قوم کی بنیاد تھا، جو منہدم ہوگئی، گذشتہ ماہ جولائی کی تاریخ ۱۹/۲۰ کی درمیانی شب کو تقریباً دس بجے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا وہ اسی قسم کا سانحہ تھا، حضرت مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے طریقت اور سلوک میں بھی مقام رفیع کے مالک تھے، ان کی ذات علوم ظاہری و باطنی کا مخزن تھی، علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ ان کا اصلی جوہر اور زیور تھا، تحریریں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں اور تقریر بھی بلا کی اثر انگیز تھی وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے اور کرتے تھے، اور اس میں انھیں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں ہوتی تھی، خود ایک درویش گوشہ نشین تھے، مگر ان کا آستانہ بڑے بڑے ارباب ثروت و دولت اور اصحاب علم و فضل کی عقیدت گاہ تھا، جو بات جو عمل تھا اخلاص اور دیانت کے ساتھ تھا، دنیوی وجاہت شہرت اور مالی حرص و آز کا شاید دل کے آس پاس بھی کہیں گذر نہ ہوا تھا، اپنے اصول اور اپنے عقیدے و خیال پر اس مضبوطی اور پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کرسکتی تھی، حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت و روحانیت کا

ایک ایسا چشمہ صافی تھا کہ ہزاروں تشنہ کام آتے اور سیراب ہو کر جاتے تھے۔
وہ جن کی زندگیاں معصیت کوشی اور عصیاں آلودگی میں بسر ہوئی تھیں یہاں
سے پاک صاف ہو کر اور گوہر مقصود سے دامانِ آرزو کو بھر کر واپس لوٹتے تھے،
ان کی زندگی اتباع سنت کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و رموز طریقت
کا دفتر گراں مایہ تھی، بعض مسائل میں علماء ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ
اختلاف رہا، لیکن تقویٰ و طہارت و تفقہ فی الدین شرعی علوم میں مہارت و
بصیرت، راست گفتاری اور مخلصانہ عمل کوشی انابت الی اللہ، بے لوث خدمتِ
دین، بے غرضانہ تلقین، رشد و ہدایت، حضرت مرحوم کے یہ وہ اوصافِ عالیہ اور
فضائل حمیدہ تھے جو ہر موافق و مخالف کے نزدیک برابر مسلم رہے، بعض عوارض
واسقام کی بنا پر گوشہ نشینی سے قبل اپنے مواعظ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے
ذریعہ حضرت مرحوم نے اصلاح عقائد و اعمال اور ابطال رسوم و بدعات کی جو
عظیم الشان خدمت انجام دی ہے وہ غالباً تمام ہی ہمصروں میں ان کا واحد طرۂ
امتیاز ہے قوم نے ان کو ''حکیم الامت کا'' خطاب دیا تھا، اور بالکل بجا دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے
ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا کہ جو خزف
ریزے تھے وہ گوہر آبدار بن گئے اور جو صرف پیتل تھے وہ زر خالص ہو گئے۔

چھوٹے بڑے رسالے اور مستقل تصانیف جو مولانا کے قلم سے شائع
ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد تازہ ترین شمار کے مطابق آٹھ سو سے اوپر بیان

کی جاتی ہے جن میں سے کثیر تصنیفات ملک میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے درجنوں ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں، کہا جاتا ہے اور غالباً اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ مولانا کی تصنیفات جواب تک طبع ہو چکی ہیں، ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ روپیہ سے کم نہیں ہے مولانا کی سیر چشمی اور فیاضی خلوص اور للّٰہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوصف آپ نے کبھی کسی کتاب کا حق اشاعت وطبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا، ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرانے کا اذن عام تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مولانا کا صرف ایک عمل ہی ایسا ہے جو آج کل کے بڑے بڑے نامور علماء کے لیے سرمایہ غیرت اور درس موعظت ہو سکتا ہے، پھر یہ تصانیف کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہیں، علماء اور فضلاء، ارباب شریعت اور اصحاب طریقت مرد اور عورتیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اردو خواں ہر ایک ان سے استفادہ کر سکتا اور اپنے لیے اصلاح ظاہر و باطن کا سامان بنا سکتا ہے، مولانا کی تحریروں میں اسرار و نکات کی علاوہ ایسا عجیب وغریب منطقی اور عقلی استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق وتائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا جس بات کو بیان کرتے ہیں، نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں، حضرت مرحوم کی تحریریں اور ان کی گفتگوئیں غیر معمولی ذکاوت وفطانت کی آئینہ دار ہوتی تھیں، بات سے بات پیدا کرنا اور ہر معاملہ کی اصل وحقیقت کو پہچاننا ان کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔

خواص کے لیے تفسیر بیان القرآن اور شرح مثنوی اور مولانا روم اور عورتوں کے لیے بہشتی زیور آپ کی ایسی گراں بہا اور کثیر الشیوع تصنیفات ہیں کہ جو اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اردو کے مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، اور موخر الذکر کتاب تو اس قدر مقبول ہوئی کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اردو خواندہ ہوگا جس نے کم از کم اس کا نام نہ سنا ہو۔

مولانا کی ولادت باسعادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو ہوئی تھی اس حساب سے آپ کی عمر تقریباً ۸۳ سال ہوتی ہے، آپ کی مفصل سوانح عمری ''اشرف السوانح'' کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں آپ کی حیات میں ہی شائع ہوگئی تھی، جس کی تصنیف کا شرف اردو زبان کے مشہور شاعر اور فاضل خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب اور مولوی عبدالحق صاحب کو حاصل ہے، اب اگر چہ حضرت مولانا کی وفات ہو چکی ہے لیکن وہ اپنی تصنیفات اور اپنے عملی کارناموں کے باعث آج بھی زندہ ہیں، خوش نصیب ہیں، وہ لوگ جو آپ کے بعد ان زندہ جاوید یادگاروں سے روشنی حاصل کریں، اور ان کی رہنمائی میں اسلام کے صراط مستقیم پر چلیں۔

حق تعالیٰ اعلیٰ علیین میں مولانا کے مدارج و مراتب بیش از بیش بڑھائے کہ وہ عمر بھر لوگوں کو اسی کی راہ کی طرف بلاتے رہے، اور قیامت میں ان کا حشر صدیقین و ابرار کے ساتھ کرے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہمیشہ ایک مومن قانت و صدیق کی ہی طرح بسر کی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور میخانہ

اشرف السوانح

(حصہ دوم)

از

منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب مولف سیرت اشرف

ناشر